اُسوۂ رسول ﷺ

سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں

درسِ قرآن وخطابِ عام

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاهور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور فون:03-35869501

www.tanzeem.org

پیش لفظ

(برطبع اوّل ۔ ۱۹۸۳ء)

انگریز کی دوسو سالہ غلامی کی وجہ سے جہاں بہت سی دوسری خرابیاں پیدا ہوئیں وہاں ہمارے دینی فکر میں سب سے بڑی کجی یہ پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کے ذہنوں سے بحیثیتِ دین اسلام کا ہمہ گیر تصور محو ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دین اور مذہب کو ایک سمجھ لیا گیا اور ان کے مابین فرق وتفاوت کو دانستہ یا نادانستہ یکسر فراموش کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ دین اور مذہب میں زمین وآسمان یا کم از کم جزو اور کل کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ''فرائضِ دینی'' کا لفظ سنتے ہی مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے اذہان میں جو تصور ابھرتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ ''اسلام کے بنیادی ارکان'' کی پابندی ہے۔

قرآن حکیم کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگ پسند ہیں جو ارکانِ دین پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جانب اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی واطاعت پر کاربند ہوں اور دوسری جانب دین کی نصرت وحمایت یعنی دعوت وتبلیغ اور غلبہ واقامت کے لئے بھی مقدور بھر سعی وجہد کریں اور اس ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے لئے اپنی بیشتر وبہتر صلاحیتیں اور قوتیں وقف کر دیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے ''فرائض دینی'' کے اس جامع تصور کو سامنے رکھتے ہوئے اُمت مسلمہ کو اصلاح وفلاح کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بجائے ''رجوع الی القرآن و السُّنۃ'' کی راہ دکھائی۔ چنانچہ اوّلاً مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کی بڑے پیمانے پر نشر واشاعت اور درس

وتدریس کے ذریعے دین اور فرائضِ دینی کے جامع تصور کو قرآنِ مجید کی آیاتِ بینات کے ذریعے پیش کیا اور پھر سیرت و سنت رسول ﷺ کے حوالے سے اسے مزید منقح و مؤکد کیا۔ متذکرہ بالا ''منتخب نصاب'' کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کا جو مسلسل درسِ قرآن مجید لاہور کی مختلف مساجد میں جاری رہا ہے اس میں جب سورۃ الاحزاب زیرِ درس آئی اور اس میں وہ مشہور آیۂ مبارکہ آئی جو عموماً سیرت کی تقاریر کا عنوان بنتی ہے' یعنی ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ تو ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس موضوع پر درس کے دوران شرح و بسط سے کام لیا بلکہ ایک نہایت مدلل و مفصل تقریر اضافی طور پر فرمائی' جو راقم کے نزدیک اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ راقم نے فرائضِ دینی سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر اور سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کے درس کو نہایت محنت و جانفشانی سے ٹیپ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا اور پھر اسے معمولی حک و اضافے کے ساتھ بالاقساط ''میثاق'' میں شائع کیا۔ اور اب ماہِ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ کی آمد کے موقع پر مستقل افادیت کے پیشِ نظر انہیں یکجا کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دین اور فرائضِ دینی کا صحیح فہم و شعور عطا فرمائے اور قرآن حکیم اور سنت و سیرتِ رسول ﷺ کی رہنمائی کے مطابق ہمیں اپنے دینِ متین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

بید اللہ التوفیق و علیہ التّکلان

احقر
جمیل الرحمٰن

عرضِ ناشر

زیرِ نظر کتاب ''اُسوۂ رسول ﷺ'' گزشتہ چند سال سے مفقود یعنی آؤٹ آف اسٹاک تھی۔ اس کا چھٹا ایڈیشن' جو تا حال آخری ایڈیشن تھا' جولائی ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا' جس کا اسٹاک ختم ہو جانے کے بعد سے مکتبہ میں یہ کتاب دستیاب نہیں تھی۔ ہماری خواہش یہ تھی کہ اس کتاب کی دوبارہ اشاعت سے قبل اس کے حسنِ ظاہری میں اضافے کے لئے اس کی کتابت دوبارہ کروائی جائے اور پوری کتاب پر بھرپور نظرِ ثانی کر کے اور ان مکررات و زوائد کو حذف کر کے جو دراصل تقریر کا خاصہ ہوتے ہیں' اس کے حسنِ معنوی کو بھی دوبالا کیا جائے۔

الحمد للہ کہ کتاب کے اس ساتویں ایڈیشن میں یہ دونوں مقصود حاصل کر لئے گئے ہیں۔ گو اس کام میں غیر معمولی تاخیر ہوئی ہے' تاہم ع دیر آید درست آید! ہمارے شعبہ مطبوعات کے مدیر حافظ خالد محمود خضر نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس کتاب پر نظرِ ثانی کر کے مناسب اصلاح کر دی ہے اور ذیلی عنوانات کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ نیز کمپیوٹر کتابت سے اس کے حسنِ ظاہری میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!

از ناظم نشر و اشاعت
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۲۷ ستمبر ۲۰۰۴ء

اُسوۂ رسول ﷺ

سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں ☆

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿ لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَ الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا ۞ وَ لَمَّا رَاَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ ۙ قَالُوۡا ہٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ صَدَقَ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ ۫ وَ مَا زَادَہُمۡ اِلَّاۤ اِیۡمَانًا وَّ تَسۡلِیۡمًا ۞ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ رِجَالٌ صَدَقُوۡا مَا عَاہَدُوا اللّٰہَ عَلَیۡہِ ۚ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَہٗ وَ مِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ ۫ وَ مَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِیۡلًا ۞ لِیَجۡزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیۡنَ بِصِدۡقِہِمۡ وَ یُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ اِنۡ شَآءَ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۞ وَ رَدَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِغَیۡظِہِمۡ لَمۡ یَنَالُوۡا خَیۡرًا ؕ وَ کَفَی اللّٰہُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الۡقِتَالَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ قَوِیًّا عَزِیۡزًا ۞ وَ اَنۡزَلَ الَّذِیۡنَ ظَاہَرُوۡہُمۡ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ مِنۡ صَیَاصِیۡہِمۡ وَ قَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الرُّعۡبَ فَرِیۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ وَ تَاۡسِرُوۡنَ فَرِیۡقًا ۞ وَ اَوۡرَثَکُمۡ اَرۡضَہُمۡ وَ دِیَارَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ وَ اَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡہَا ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرًا ۞﴾ (آیات ۲۱ تا ۲۷)

خطبۂ مسنونہ ‘ تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد:

حضرات! ان آیات پر ہماری گفتگو دو حصوں میں ہوگی۔ ایک تو ان شاء اللہ ہم درس کی صورت میں اس رکوع کو ختم کریں گے۔ پھر اس رکوع میں اسوۂ حسنہ سے متعلق

☆ سورۃ الاحزاب کی آیات ۲۱ تا ۲۷ پر مشتمل یہ درس محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ نے اپنے مسلسل درس قرآن کریم کے دوران جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں مئی ۱۹۷۹ء میں دیا۔

جو مضامین آئیں گے‘ ان کو ہم صرف علمی اعتبار ہی سے سمجھنے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ اس رکوع کے مضامین کی جو تعلیم عملی انطباق (Practicable Application) سے متعلق ہے اور ہمارے لئے اس میں جو عملی سبق ہے اس کو میں بعد ازاں ایک تقریر کی شکل میں کسی قدر وضاحت سے آپ کے سامنے رکھوں گا۔ ارشاد ہوا:

﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾

’’یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔‘‘

اسوہ کے لفظ کا مادہ ’’اس وٗ‘‘ ہے۔ اُسوہ اور اِسوہ دونوں اس کے تلفظ ہیں۔ جس طرح قُدوہ اور قِدوہ دونوں ہم معنی ہیں‘ اسی طرح لفظ اُسوہ اور اِسوہ دونوں استعمال ہوتے ہیں‘ اور اس کا معنی ومفہوم ہے کسی کا اتباع کرنا‘ اور اس اتباع کو اپنے اوپر لازم کر لینا‘۔ خواہ اس میں کوئی تکلیف ہو خواہ مسرت۔ چنانچہ کسی کے اتباع کو اپنے اوپر مسرت وراحت اور تکلیف ومضرت دونوں کیفیات میں لازم کر لینا اسوہ ہوگا۔ اردو میں جب اس لفظ کا ترجمہ ایک لفظ میں کیا جائے گا تو ’’نمونہ‘‘ اس کے قریب ترین مفہوم کا حامل ہے‘ لیکن اس ترجمے سے ’’اسوہ‘‘ کا حقیقی مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اصل میں ’’اتباعِ سنت‘‘ کی جو اصطلاح ہمارے ہاں زیادہ معروف ہے اسی کی ایک نہایت حسین وجمیل تعبیر لفظ اسوہ میں موجود ہے۔

یہاں ’’لَکُمۡ‘‘ (تمہارے لئے) عام ہے۔ گویا اس کے مخاطب صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں ہیں‘ بلکہ تا قیامِ قیامت تمام مسلمانوں کے لئے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اور حیاتِ طیبہ ایک اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ ہے۔

قرآن مجید اور اُسوۂ رسولؐ میں ایک قدرِ مشترک

آگے فرمایا: ﴿لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَ الۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا ۞﴾ یہ درحقیقت ’’لَکُمۡ‘‘ کا بدل آ رہا ہے۔ آیت کے اس ٹکڑے میں وہ دونوں مفاہیم جمع کر دیئے گئے ہیں جو قرآن مجید کے بارے میں سورۃ البقرۃ میں دو مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ قرآن اپنی جگہ ہر نوعِ بشر کے لئے ہدایت کاملہ اور ہدایت تامہ ہے۔ اس میں تا قیامِ قیامت ہر دَور میں تمام نوعِ انسانی کے لئے ہدایت ورہنمائی موجود ہے اور یہ ہر

اعتبار سے اکمل واتم ہے۔ چنانچہ قرآن کو ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' کہا گیا ہے۔ (البقرہ: ۱۸۵) یہ علی الاطلاق ہے' یعنی یہ تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔ لیکن سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت میں اس قرآن کو ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس ہدایت سے استفادہ کرنے کی ایک شرط ہے' اور وہ تقویٰ ہے۔ یعنی کچھ خدا ترسی ہو' کچھ اللہ کی طرف انابت ہو' نیکی اور بدی کا کوئی شعور بیدار ہو' انسان خیر وشر میں امتیاز کرتا ہو۔ چنانچہ تقویٰ کا اساسی سرمایہ اور بنیادی اثاثہ اگر موجود نہیں ہوگا تو انسان اس قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کر سکے گا۔ قرآن اپنی جگہ ہدایتِ کاملہ وتامہ ہے' لیکن اس سے استفادے کے لئے جو شرط خود انسان کے باطن میں پوری ہونی چاہئے وہ شرط تقویٰ ہے' لہٰذا سورۃ البقرۃ آیت نمبر۲ میں ارشاد ہوا: ﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞﴾ اور آیت نمبر۱۸۵ میں فرمایا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾

آپ میں سے شاید بعض حضرات کے علم میں ہو کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی بدنامِ زمانہ کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کے چودھویں باب میں قرآن مجید پر جو اعتراضات کئے تھے ان میں پہلا اعتراض یہی تھا کہ یہ عجیب کتاب ہے جو کہتی ہے کہ یہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔ متقیوں کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ ہدایت کی ضرورت تو گمراہوں' فاسقوں اور فاجروں کو ہے۔ قرآن مجید کا سرسری مطالعہ کرنے والوں کو یہ اشکال پیش آ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ذہنوں میں تقویٰ کا جو تصور ہے' وہ یہ ہے کہ انسان بہت نیک ہو' بہت خدا ترس ہو' اور وہ ہر اعتبار سے اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے ہوئے ہو۔ یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں محتاط ہو۔ ایسے شخص کو ہم متقی کہتے ہیں۔ لہٰذا ان معانی میں جب لفظ تقویٰ سامنے آتا ہے تو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے بارے میں واقعتاً ذہن میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ وہ اشکال انتہائی بھونڈے طریقے پر اُس شخص نے پیش کیا۔ تو اِس کا حل یہی ہے کہ قرآن مجید درحقیقت ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' ہی ہے' لیکن اس سے استفادے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ تقویٰ کا کچھ نہ کچھ

بنیادی اثاثہ موجود ہو۔ ایک شخص میں اگر نیکی اور بدی اور خیر وشر کی تمیز کی کچھ بھی پونجی باقی ہے تو گویا وہ بنیاد موجود ہے جس پر ہدایت کا دارومدار ہے۔ آج کل کی تعمیرات کی ٹیکنیک میں اسے starter کہتے ہیں۔ یعنی اگر آپ کو عمارت کا کالم مزید اوپر لے جانا ہے تو کچھ سریئے باہر نکلتے چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ اوپر کے کالم کو چڑھاتے وقت اس کا جوڑ اس کے ساتھ لگ جائے۔ پس جس طرح کسی عمارت کے کالم کو مزید اُوپر لے جانے کے لئے starter کا ہونا ضروری ہے' اسی طرح قرآن مجید سے استفادے کے لئے تقویٰ یعنی خیر وشر اور نیکی وبدی کی کچھ نہ کچھ تمیز انسان میں ہونی ضروری ہے۔

بعینہٖ یہی بات اسوۂ رسول ﷺ کے ضمن میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پوری نوعِ انسانی کے لئے بھی مجسم ہدایت ہیں۔ آپؐ کے لئے قرآن مجید میں لفظ نور آیا ہے' بایں معنی کہ آپؐ نورِ ہدایت' شمع ہدایت اور سراجاً منیراً ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید آپؐ کو رحمۃ للعالمین قرار دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کتابِ متلو ہے اور نبی اکرم ﷺ قرآنِ مجسم ہیں۔ جیسا کہ آپؐ کی وفات کے بعد چند لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپؐ کی سیرت کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپؓ نے جواب میں فرمایا تھا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ۔ لیکن آپؐ کے اس اُسوۂ نور اور شمع ہدایت سے روشنی حاصل کرنے کے لئے بھی چند شرائط کو پورا کرنا لازم ہے۔ اگرچہ آپؐ اپنی جگہ شمع ہدایت ہیں اور جو چاہے آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کر لے' لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں۔ ان شرائط کو یہاں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

﴿لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۞﴾

''ہر اُس شخص کے لئے (نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اعلیٰ وارفع نمونہ ہے) جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔''

آیت کے اس حصے میں دو چیزیں جمع ہوگئی ہیں۔ ایک ایمان باللہ اور دوسرا ایمان بالآخرۃ۔ ہمارے دین کے تین بنیادی ایمانیات ہیں' جو گویا تین Pillars of Faith

ہیں ۔(۱) ایمان باللہ یا توحید (۲) ایمان بالآخرہ یا معاد اور (۳) ایمان بالرسالت ۔ ایمان بالرسالت سے نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعلق ہے۔ یہ ایمانیات ثلاثہ باہم گتھے ہوئے ہیں۔ اگر کسی انسان کا اللہ پر ہی یقین نہیں یا اس میں شرک شامل ہے تو وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اپنے لئے نمونہ کیسے بنالے گا! اور اگر اسے آخرت کا یقین نہیں تو پھر وہ آنحضرت ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کیسے کرے گا! یہ پہلی دو چیزیں ہوں گی تو تیسری بات کا امکان پیدا ہوگا۔ یعنی وہ شخص جو اللہ سے غافل ہو یا کبھی کبھار یا اتفاقاً اللہ کا نام لینے والا ہو اور جو اللہ سے ملاقات کی حقیقی امید دل میں نہ رکھتا ہو اسی طرح جس شخص کو یوم آخرت اور محاسبۂ اُخروی کی کوئی توقع نہ ہو گویا جو ان دو ایمانیات سے تہی دست ہو اس کے لئے آنحضرت ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اسوہ اور نمونہ نہیں بن سکتی۔ آنحضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کا اتباع وہی شخص کرسکے گا جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا امیدوار بھی ہو اور جس کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہو کہ آخرت ہونے والی ہے جہاں کی کامیابی کا سارا دارومدار اسی بات پر ہوگا کہ اس دنیا کی زندگی میں اس کا طرزِ عمل اور رویہ اللہ کے رسول ﷺ سے کس درجے قریب تر رہا ہے۔ لہٰذا بات صاف کردی گئی کہ:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ ﴾

اس پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس شخص کے لئے اسوۂ حسنہ ہے اور وہی اس کا اتباع کرسکے گا اور وہی آپؐ کے نقش قدم پر چل سکے گا جو اللہ کا طالب ہو اور جو آخرت میں سرخروئی چاہتا ہو اور جو کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ یہاں رجاء کا جو لفظ آیا ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ اس میں طالب ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے اور اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہونے کا مفہوم تو بالکل واضح ہے جس کی وضاحت وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ سے مزید ہوگئی۔ یہاں امیدواری میں اللہ کی رحمت، اللہ کی شفقت، اللہ کی نظر عنایت کے جملہ مفاہیم شامل ہیں۔ جیسے سورۃ الکہف کی

آیت ۲۸ میں فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ ''وہ لوگ جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح و شام اپنے ربّ کے چہرۂ انور کے طلبگار بن کر''۔ وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالبین ہیں۔

یہاں فرمایا: ﴿ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ﴾ ''جو اللہ کی رضا کا امیدوار ہے اور جو یومِ آخرت میں سرخروئی کی توقع رکھتا ہے۔'' گویا اسے یقین ہے کہ یہ دن آکر رہے گا اور جزا و سزا کے فیصلے ہو کر رہیں گے۔ ﴿ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ ﴾ ''اور وہ اللہ کو یاد رکھتا ہو کثرت کے ساتھ۔'' یعنی وہ ہر کام اور معاملے میں اللہ کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کا التزام و اہتمام کرتا ہو اور زبان و قلب سے بھی اللہ کو یاد کرتا ہو۔ وہ اس بات کو ہر لمحہ اور ہر لحظہ قلب و شعور میں مستحضر رکھتا ہو کہ اسے یوم آخرت میں اللہ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی اس دُنیوی زندگی کا حساب دینا ہے۔ یہ تین شرطیں پوری ہوں گی تو اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کسی درجے عمل پیرا ہونے کا امکان پیدا ہوگا۔

اسوۂ حسنہ کی پیروی کا عملی نمونہ

اب چونکہ یہاں نبی اکرم ﷺ کے اتباع کا مضمون چلا ہے تو ضرورت تھی کہ مثال پیش کرکے بتایا جائے کہ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرنے والوں کا رویہ کیا ہوتا ہے اور ان کے طرزِ عمل میں کیا فرق واقع ہوتا ہے! لیکن قرآن حکیم میں آپ کو یہ اسلوب عام ملے گا کہ استدلال کی کڑیوں کو بسا اوقات اس طرح نمایاں نہیں کیا جاتا جس طرح ہم نمایاں کرتے ہیں کہ اس بات کا نتیجہ یہ نکلا یا یہ نکلنا چاہئے۔ جیسے ہم کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے اِس اسوۂ حسنہ کی کامل مثال دیکھنی ہو تو صحابہ کرام ؓ کی زندگیوں کو دیکھو جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات کہے بغیر اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ان الفاظ میں ذکر فرمادیا گیا:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ ﴾

''اور حقیقی مؤمنوں کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ وہی بات ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اور اس صورت حال نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔''

یہ بات گویا اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ایک عملی نمونہ اور مظاہرہ ہے۔

غزوۂ احزاب کے تناظر میں اصل اسوۂ رسولؐ

یہ اسوۂ حسنہ کیا ہے جس کا اس سورۃ الاحزاب میں ذکر کیا گیا ہے؟ اسے ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھنا ہوگا۔ یوں تو نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی ہر مسلمان کے لئے ہر اعتبار سے ایک کامل نمونہ ہے۔ ایک باپ کے لئے آپؐ بہترین نمونہ ہیں کہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ ایک شوہر کے لئے آپؐ کامل نمونہ ہیں کہ اسے اپنے گھر میں اپنی بیوی یا بیویوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ ایک پڑوسی کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک مرشد و مزکی، ہادی و داعی اور مبلغ کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک حکمران اور سربراہ ریاست کے لئے آپؐ اسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک منصف اور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے لئے آپؐ اسوۂ کاملہ ہیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اکمل و اتم نہ ہو۔

میں کئی مرتبہ سیرت کی تقاریر میں اپنے اس شدتِ تاثّر کو بیان کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ کے مطالعے سے میں مبہوت ہو جاتا ہوں اور میرے قلب پر نبی اکرم ﷺ کی شخصیت مطہرہ کا یہ گہرا تاثر ثبت ہوتا ہے کہ اس قدر جامع شخصیت تو ہمارے تصور میں بھی آنی ممکن نہیں۔ کیا زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جو اسوۂ حسنہ کے اعتبار سے نامکمل و ناتمام اور خالی نظر آتا ہو!۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ ہر پہلو سے مصروف ترین اور گھمبیر ترین تھی۔ ہمارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ جو مسجد کا امام ہو وہ عموماً خطابت نہیں کرتا، خطیب علیحدہ ہونا چاہئے۔ جو خطیب صاحب ہیں وہ پانچ وقت کی نماز

پڑھانے کی پابندی کیسے قبول کر لیں گے! گویا کہ امامت علیحدہ، خطابت علیحدہ۔ پھر مدرس علیحدہ۔ مزید برآں جو صاحب درس کے فرائض انجام دے رہے ہوں، عام طور پر ان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ یہ تزکیہ و تربیت بھی کریں گے۔ اس کے لئے کہیں اور جائیے۔ یہاں سے تو علم حاصل کر لیجئے، مدرسین قال اللہ تعالیٰ اور قال رسول اللہ ﷺ پڑھا دیں گے، تزکیۂ نفس کے لئے عموماً کسی دوسرے مزکی و مرشد کی تلاش کرنی ہوگی، جن کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ مرحلہ طے کرنا ہوگا۔ پھر جو لوگ ان شعبوں سے متعلق ہیں ممکن نہیں کہ وہ آپ کو کہیں سپہ سالار بھی نظر آئیں! یا کم از کم کچھ انتظامی امور کی انجام دہی میں ہی مصروف ملیں! ایسے لوگ اگر لکھنے پڑھنے اور تدریس و تعلیم میں زندگی بھر لگے رہے یا دعوت و تبلیغ ہی میں پوری زندگی کھپا دی اور ان میدانوں میں انہوں نے کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دیا تو عموماً ایسے لوگوں کا گھر گرہستی والا کھاتہ کورا نظر آئے گا۔ معلوم ہوگا کہ ساری عمر شادی ہی نہیں کی جب کہیں جا کر یہ کام انجام دیئے ہیں۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں جو جامعیت ہے وہ پوری انسانی تاریخ حتیٰ کہ انبیاء و رُسل کی مقدس جماعت میں بھی کہیں اور نظر نہیں آئے گی۔ آپؐ مسجد نبوی کے پنج وقتہ امام بھی ہیں اور خطیب بھی ہیں، اصحابِؓ صفہ کے لئے مدرس و معلم بھی ہیں، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے آپ مزکی و مربی بھی ہیں۔ آپؐ ہی سپہ سالار بھی ہیں۔ صلح کی گفتگو ہو رہی ہے تو آپؐ ہی کر رہے ہیں۔ باہر سے جو وفود آ رہے ہیں تو ان سے آپؐ ہی معاملہ کر رہے ہیں۔ مقدمات و تنازعات ہیں تو وہ آپؐ کی عدالت میں پیش ہو رہے ہیں۔ تصور تو کیجئے کہ کون سا میدان اور کون سا پہلو ہے جہاں یہ محسوس ہو کہ ہمیں حضور ﷺ کی زندگی میں نمونہ نہیں مل سکتا؟ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ بغیر کسی تنقیص کے میں یہ عرض کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بچائے کہ میں کسی نبی کی توہین کروں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک باپ کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں، ایک شوہر کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔ کسی قاضی، کسی سپہ سالار، کسی فاتح اور کسی صدر ریاست کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔

آنجنابؐ ایک درویش، ایک مبلغ اور ایک مربی ومزکی کی حیثیت سے تو ایک مکمل نمونہ ہیں، لیکن زندگی کے دوسرے شعبے اور پہلو خالی نظر آرہے ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ میرے قلب وذہن اور شعور وادراک پر جس چیز کا گہرا تاثر ہے وہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی اسی جامعیت کا ہے۔ میں جب گرد وپیش کا جائزہ لیتا ہوں اور حالات کو خود اپنے اوپر وارد کرتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم ایک ذمہ داری کا بھی حق ادا نہیں کر پاتے اور اسے نباہ نہیں پاتے، جبکہ وہاں کیا عالم ہے! کون سی ذمہ داری ہے جو نہیں اٹھائی ہوئی ہے اور اس کو کما حقہ پورا نہیں کیا ہے! کون سی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی میں کوئی کمی رہ گئی ہو! الغرض نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہر اعتبار، ہر پہلو اور ہر حیثیت سے اکمل واتم ہے۔ حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ تو اللہ کا نازل کردہ قرآن حکیم ہے اور دوسرا عظیم معجزہ خود نبی اکرم ﷺ کی اپنی ذات اور شخصیت ہے اور اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ نے اس قدر گھمبیر اور اتنی ہمہ گیر زندگی گزاری ہے کہ ہمارے ہوش اور حیطۂ خیال میں بھی نہیں آتی۔ یہ بھی خاصہ نبوت ہے اور یہ صلاحیتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کے اعتبار سے ایک اسوۂ کامل ہیں۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن مجید میں جب یہ لفظ "اسوۃٌ حسنۃٌ" آیا ہے تو کس سیاق وسباق اور سلسلۂ عبارت (context) میں آیا ہے اور اس حوالے سے آپ کا اصل اور خصوصی اُسوہ کون سا ہے!۔ یہ اسوۂ حسنہ وہ ہے جو ہمیں غزوۂ احزاب میں نظر آتا ہے۔ وہ صبر وثبات، اللہ کے دین کے لئے سرفروشی وجان فشانی کہ جان نثاروں کے شانہ بشانہ اور قدم بقدم ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہر مشقت میں آپؐ بھی شریک تھے۔ کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اٹھائی ہو اور آپؐ نے نہ اٹھائی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ کہیں زرنگار خیمہ علیحدہ لگا دیا گیا ہو، جہاں قالین بچھا دیئے گئے ہوں اور وہاں حضور ﷺ آرام فرما رہے ہوں اور مورچھل جھلے جا رہے ہوں، جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم خندق کھودنے کے لئے کدالیں چلا رہے ہوں۔

بلکہ معاملہ یہ تھا کہ خندق کھودنے والوں میں آپ ﷺ بھی شامل ہیں۔ کدالیں چلاتے ہوئے صحابہ کرام ؓ بیک آواز کہہ رہے ہیں: **اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ** اور نبی اکرم ﷺ ان کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر فرما رہے ہیں: **فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ** ۔ یعنی سردی اور بھوک کی تکالیف اٹھانے میں آپؐ برابر کے شریک ہیں۔ اس خیال سے کہ بھوک اور نقاہت سے کہیں کمر دہری نہ ہو جائے، صحابہ کرام ؓ نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ ایک صحابیؓ حضور ﷺ کو اپنے پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھاتے ہیں۔ اس پر سرورِ عالم محبوب ربّ العالمین، خاتم النبیین والمرسلین ﷺ اپنا کرتا اٹھاتے ہیں تو اُن صحابیؓ کو شکم مبارک پر دو پتھر بندھے نظر آتے ہیں۔ محاصرے کے دوران آپ ﷺ ہر وقت وہاں موجود رہے اور جس طرح صحابہ کرام ؓ تکان سے چور ہو کر پتھر کا تکیہ بنا کر تھوڑی دیر کے لئے آرام کی خاطر لیٹ جاتے تھے، اسی طرح حضور ﷺ بھی وہیں کھلی زمین پر کچھ دیر کے لئے پتھر پر سر رکھ کر آرام فرما لیا کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ نے استراحت کے لئے اپنے واسطے کوئی خصوصی اہتمام فرمایا ہو۔ بنی قریظہ کی غدّاری کے بعد جس خطرے میں سب مسلمانوں کے اہل وعیال مبتلا تھے، اسی سے آپؐ کے اہل بیت بھی دوچار تھے۔ اپنے لئے یا اپنے اہل وعیال کے لئے آپؐ نے حفاظت کا کوئی خصوصی انتظام نہیں کیا تھا۔

یہ ہے اصل صورت واقعہ اور صورت حال، جس میں فرمایا گیا کہ: **لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ** ۔ اور ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کی پیروی کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عمل پیرا ہیں! ویسے تو ہر چھوٹی سے چھوٹی سنت بھی وقیع اور لائق اتباع ہے۔ لیکن اگر یہ چھوٹی سنتیں اس اصل اور بڑے اسوہ کے لئے اوٹ بن جائیں تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ ان چھوٹی سنتوں پر عمل کرنے کے باعث کسی کو یہ مغالطہ اور فریب ہو سکتا ہے کہ "میں بڑا متبعِ سنت ہوں۔ میں نے داڑھی بھی چھوڑ رکھی ہے، لباس میں بھی میں سنت کو پیش نظر رکھتا ہوں۔ میں نے یہ بھی اہتمام کر رکھا ہے اور وہ بھی اہتمام کر رکھا ہے"۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ اسوہ بھی زندگی

میں ہے یا نہیں جو سورۃ الاحزاب میں بیان ہوا ہے! دعوت وتبلیغ اور اقامت و اظہار دین الحق کے لئے سرفروشی‘ جاں فشانی اور عملی جدوجہد اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات‘ تکالیف اور مصائب کو برداشت کرنا۔ اگر زندگی میں یہ نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر تو درحقیقت یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں آڑ بن گئی ہیں۔ اس تل کے پیچھے پہاڑ اوٹ میں آ چکا ہے۔ اور ہمارا اِس وقت سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل ’’اسوہ‘‘ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے (الا ماشاءاللہ) اور وہ اسوہ یہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور غزوۂ احزاب کے حالات کے بیان میں قرآن حکیم اس کی طرف مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصی طور پر مرتکز (focus) کرتا ہے۔

امتحان وآزمائش میں صحابہ کرامؓ کا طرزِعمل

پھر اس اسوۂ حسنہ کا جو ٹھپا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت وکردار پر لگا ہے اور اس کی جو چھاپ ان کی زندگیوں میں آئی ہے وہ یہ ہے: ﴿وَلَمَّا رَاَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ ۙ قَالُوۡا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ ۫﴾ جیسے کوئی مشین یا پریس ہو‘ اس میں لوہے کے ٹکڑے یا کاغذ رکھے ہوں تو جو ڈائی یا بلاک اس میں فٹ ہے‘ اسی کا نقش (impression) ان پر آتا چلا جائے گا۔ اسی طرح یہ اس ’’اُسوۂ حسنہ‘‘ کا نقش ہے جو صحابہ کرام ؓ نے قبول کیا۔ ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کا مجموعہ بنا کر اسے ہی کل ’’اُسوہ‘‘ سمجھ بیٹھے ہیں اور ہمارا حال (الا ماشاءاللہ) یہ ہو گیا ہے کہ مچھر چھانے جا رہے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جا رہے ہیں۔ یہ وہ تمثیل ہے جو علمائے یہود کے اس طرزِعمل پر حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی کہ مہماتِ دین اور مقتضیاتِ دین کی طرف سے تو انہوں نے آنکھیں بالکل پھیر لی تھیں یا بند کر رکھی تھیں اور جزئیات وفروعات کو وہ کل دین سمجھ بیٹھے تھے اور اسی کی تدریس وتعلیم میں مصروف رہتے تھے اور اس ضمن میں ذرا سی کمی بیشی پر لوگوں کو سرزنش بھی کرتے تھے اور ان کی تکفیر بھی کرتے تھے۔ حضرت مسیحؑ کی بیان کردہ یہ تمثیل دنیا کے ہر کلاسیکل ادب میں

ہمیشہ ہمیش کے لئے ضرب المثل بن گئی ہے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ خدارا میری اس گفتگو کا ہرگز یہ مطلب نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں چھوٹی چھوٹی سنتوں کی تحقیر کر رہا ہوں یا ان کی اہمیت گھٹا رہا ہوں‘ معاذ اللہ! نبی اکرم ﷺ کی ہر سنت‘ چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو‘ واجب الاتباع ہے۔ ان سنتوں کا اہتمام والتزام اگر اس ’’اُسوہ‘‘ کے ساتھ ہو جو اِس سورۂ مبارکہ کے مطالعے کے ذریعے ہمارے سامنے آ رہا ہے تو سونا ہے‘ اس کے بغیر ہو تو تانبا ہے‘ جس کی سونے کے مقابلے میں کوئی قدر وقیمت نہیں۔ اس لئے کہ اگر نسبت وتناسب درست نہیں ہو گا تو صحیح نتیجہ کیسے برآمد ہو گا! پھر تو وہی طرزِعمل وجود میں آئے گا جو میں حضرت مسیحؑ کی تمثیل کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں۔

اس ’’اُسوہ‘‘ کی چھاپ صحابہ کرامؓ کی شخصیتوں پر جو پڑی تو کیفیت یہ ہو گئی کہ جب انہوں نے ان لشکروں کو دیکھا جو اُمڈ اُمڈ کر اِدھر سے بھی آ رہے تھے اور اُدھر سے بھی آ رہے تھے تو وہ خوفزدہ نہیں ہوئے‘ بلکہ وہ کہنے لگے کہ یہ حالات تو پیش آنے والے تھے‘ جن کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے وعدہ کیا تھا۔ خیبر سے کیل کانٹے سے لیس یہودیوں کے لشکر بھی آ گئے۔ مکہ سے ابوسفیان ایک لشکر جرار لے کر آ گئے۔ مشرق سے غطفان کے قبائل آ گئے۔ آیت نمبر ۱۰ میں ان تمام حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور پھر آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا گیا: ﴿هُنَالِكَ ابۡتُلِيَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَزُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِيۡدًا ۝﴾ ’’یہ وہ وقت تھا جب اہل ایمان خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے‘‘۔ یہ نہایت کڑا امتحان تھا صحابہ کرام ؓ کے صبر وثبات کا۔ یہ آزمائش تھی ان کی استقامت اور استقلال کی! سردی کا موسم تھا۔ پھر ہر چہار طرف سے حملہ آوروں کے لشکر پر لشکر جمع ہو گئے تھے جن کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی اور مسلمان خندق کے اِس پار محصور تھے۔ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ برابر خبریں مل رہی تھیں کہ مدینہ کے باہر جنوب مغرب میں بنو قریظہ کا جو یہودی قبیلہ آباد تھا اور جس سے معاہدہ تھا کہ وہ مدینہ پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے‘ وہ ساتھ دینے کے بجائے نقضِ عہد پر تلے بیٹھے ہیں‘ اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ پیچھے سے کب مدینہ پر حملہ آور ہو

جائیں، جہاں نہ صرف دفاع کا کوئی انتظام نہیں تھا بلکہ مدینہ میں صرف خواتین اور بچے موجود تھے۔ ان حالات میں اہلِ ایمان کی کیفیات کیا تھیں اور ان کی زبان سے کیا الفاظ نکلے! یہ کہ:

﴿قَالُوْا ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ﴾

''انہوں نے کہا کہ اسی کا تو وعدہ کیا تھا اللہ نے اور اس کے رسول (ﷺ) نے، اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا۔''

امتحان وآزمائش۔اللہ تعالیٰ کی سنت ثابتہ

تعین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان مؤمنین صادقین کے اس قول کے وقت قرآن مجید کا کون سا مقام اور کون سی آیت ان کے سامنے ہوگی۔ ویسے قرآن حکیم میں یہ مضمون مختلف اسالیب سے بار بار آیا ہے کہ ہم اہل ایمان کا امتحان لیتے ہیں، ہم انہیں آزماتے ہیں، ہم ایمان کے دعوے داروں کو آزمائیں گے۔ سورۃ العنکبوت، جو مکی سورت ہے، اس کے پہلے رکوع میں یہ مضمون خوب واضح طور پر آیا ہے اور یہ رکوع ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ فرمایا:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۞ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ ۞﴾ (آیات:۲،۳)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے، اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں!''

پھر سورۃ البقرۃ جو مدنی سورت ہے، کی آیت ۲۱۴ میں فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَاْتِکُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ ؕ مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ؕ﴾

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟''

معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کی متعدد آیات کے ذریعے آزمائش و امتحان سے گزارنے کی اس سنت ثابتہ سے اہل ایمان کو بہت پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو آزمائش و ابتلاء کی بھٹیوں سے گزارا جائے گا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دیا جائے۔ البتہ میرے خیال میں ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ کے پس منظر میں سورۃ البقرۃ کی یہ آیات آتی ہیں:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۞ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۞ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ ۣ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ۞﴾ (آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷)

''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف وخطر، تنگی، فاقہ کشی اور جان و مال اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے، انہیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے ربّ کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی، اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کی کیفیات سے ان آیات کے ذریعے اہل ایمان کو پیشگی مطلع کر دیا گیا تھا۔ ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ کے پس منظر میں یہ آیات بہت نمایاں ہیں۔ اہل ایمان کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ شعوری طور پر جانتے بھی تھے اور منتظر بھی تھے کہ سخت سے سخت آزمائشیں، امتحانات اور ابتلاءات آنے والے ہیں۔

میں سیرتِ مطہرہ کی تقاریر میں یہ بات کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر ''یومِ طائف'' نبی اکرم ﷺ کے لئے سب سے کٹھن اور سب سے سخت دن تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب دریافت کیا کہ آپؐ پر یومِ اُحد سے زیادہ کوئی سخت دن گزرا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ ''ہاں' مجھ پر جو سخت ترین دن گزرا ہے وہ یومِ طائف تھا''۔ چنانچہ شخصی اعتبار سے حضور کے لئے یوم طائف ابتلاء وآزمائش کا نقطۂ عروج (climax) ہے' جبکہ بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت کے لئے غزوۂ احزاب آزمائش کی چوٹی ہے۔ جس کا نقشہ پچھلے رکوع میں یوں کھینچا گیا ہے کہ: هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ غور کیجئے کہ یہاں بھی وہی انداز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آخری امتحان یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے سے متعلق وارد ہوا ہے کہ ﴿وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝﴾ (الصّٰفّٰت: ۱۰۴۔۱۰۶) میں سمجھتا ہوں کہ ''شاباش'' کا اس سے بہتر اسلوب ممکن نہیں ہے کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ امتحان فی الواقع سخت تھا۔ وہی انداز اور اسلوب یہاں ہے کہ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۔ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ ہم نے اہلِ ایمان کا کٹھن امتحان لے لیا اور ان کو خوب جھنجوڑ لیا۔

جب اہل ایمان اس امتحان اور آزمائش میں ثابت قدم نکلے تو دشمنانِ دین کے جو لشکر بادلوں کی طرح اُمڈ کر آئے تھے وہ ایسے چھٹ گئے جیسے تھے ہی نہیں۔ غزوۂ احد میں تو ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے لیکن یہاں کھلے مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ ایک دو مرتبہ خندق میں کود جانے والے کفار سے کچھ مبارزتیں ہوئیں اور تیر اندازی سے چند صحابہؓ شہید ہوئے جن کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں۔ اس غزوے میں باقاعدہ کھلا مقابلہ تو ہوا ہی نہیں۔ البتہ محاصرہ بڑا شدید اور خطرہ بڑا مہیب تھا کہ محاصرے کی طوالت' دشمنانانِ اسلام کے لشکر کی تعداد' پھر سردی کا عالم اور سامانِ خورد و نوش کی قلت کی وجہ سے خندق میں موجود صحابہ کرامؓ کو سخت تکالیف و مشکلات کا سامنا

کرنا پڑ رہا تھا' جس کا نقشہ آیت نمبر۱۰ میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے کہ ﴿وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ ''جب خوف کی وجہ سے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے مُنہ کو آنے لگے۔'' تو اِن حالات میں مؤمنینِ صادقین کی دلی کیفیات اور ان کے صبر و ثبات کا نقشہ اس آیت میں ہمارے سامنے یہ آیا کہ:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ ﴾ (آیت۲۲)

''اور حقیقی اہل ایمان کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا' اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اور اس واقعہ نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیات میں مزید اضافہ کر دیا۔''

اس کے برعکس منافقین اور وہ لوگ جو ضعفِ ایمان کا شکار تھے' ان کا کیا حال تھا؟ فوری تقابل کے لئے ان کی دلی کیفیات سے متعلق آیات بھی دیکھ لیجئے:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۭ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُىِٕلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ۝ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ۝﴾ (آیات۱۲تا۱۵)

''اور یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمہارے لئے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے' پلٹ چلو۔ جب ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں' حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے' دراصل وہ (محاذِ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف

دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریک فتنہ ہونے
میں کوئی تامل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ
پھیریں گے، اور اللہ سے کئے ہوئے عہد کی باز پرس تو ہونی ہی تھی''۔

اس امتحان و آزمائش کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین اور مؤمنین صادقین علیحدہ علیحدہ
نمایاں ہو گئے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر جو منافقین راستے ہی سے پلٹ گئے تھے انہوں
نے عہد کیا تھا کہ اگر آئندہ آزمائش کا کوئی موقع آیا تو وہ ہرگز پیٹھ نہ پھیریں گے۔
غزوۂ خندق میں جب اُحد سے بھی بڑا خطرہ سامنے آیا تو ان منافقین کا پول کھل گیا اور
واضح ہو گیا کہ یہ لوگ اپنے اس عہد میں کتنے مخلص اور سچے تھے۔

غزوۂ احزاب میں نصرتِ الٰہی کی آمد

جب امتحان مکمل ہو گیا اور مؤمنینِ صادقین اور منافقین بھی چھٹ کر نمایاں ہو گئے
تو نصرتِ الٰہی آ گئی اور ایک مہینے کے محاصرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک سخت آندھی
بھیج دی اور ایسے نادیدہ لشکر اتارے جنہوں نے دشمنوں کے کیمپ میں کھلبلی ڈال دی۔
مزید برآں اپنی غیبی تائید سے کچھ ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ ان حملہ آوروں کو اِسی
میں عافیت نظر آئی کہ اپنے ڈیرے اٹھا کر چلتے بنے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا
عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا ۝﴾

(آیت ۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے
تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور
ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہیں آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم
لوگ اس وقت کر رہے تھے۔''

رات کو پورا لشکر موجود تھا، صبح دیکھا تو میدان خالی پڑا تھا۔ رات کی شدید آندھی
نے ان لشکروں کے خیموں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور نظر نہ آنے والی فوجوں نے کھلبلی مچا

دی، جس کے نتیجے میں تمام حملہ آور لشکر صبح طلوع ہونے سے پہلے اپنا بوریا بستر گول کر
کے کوچ کر گئے۔ ''نظر نہ آنے والی فوجوں'' سے مراد وہ مخفی قوتیں اور اللہ تعالیٰ کے
مقرر کردہ وہ فرشتے ہیں جو اِس کائنات کے نظام اور انسانی معاملات میں اللہ کے حکم
سے کام کرتے رہتے ہیں اور انسان ان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری
اسباب پر محمول کرتا ہے۔ بہرحال اس تمام صورت حال کی غرض و غایت دراصل
آزمائش و امتحان تھی، جس میں مخلص اہل ایمان پورے اترے اور انہوں نے منافقین
کے قول ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝﴾ کے برعکس دلی یقین کے ساتھ یہ
کہا کہ: ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾۔ اس ابتلاء سے نہ وہ
ہراساں اور خوف زدہ ہوئے اور نہ ہی ان کے حوصلے پست ہوئے، بلکہ ان کی کیفیات
یہ تھیں کہ: ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ۝﴾ یعنی اس پوری صورتِ حال
نے ان کے ایمان اور ان کی تسلیم و رضا کی کیفیات کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور وہ پورے
قلبی اطمینان اور انبساطِ قلب کے ساتھ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے
لئے تیار ہو گئے۔ آیت کے اس ٹکڑے میں ''زَادَ'' کا فاعل دراصل وہ پوری صورت
حال ہے جو غزوۂ احزاب میں پیش آئی۔

ایمان میں کمی بیشی۔ امام اعظمؒ اور امام بخاریؒ کا موقف

اب دیکھئے کہ یہ آیت اس بات کے لئے بھی نص ہو گئی کہ ایمانِ حقیقی بڑھتا بھی ہے۔
یہاں کسی ابہام کے بغیر فرمایا گیا ہے کہ اس صورتِ واقعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مؤمنین صادقین کے
ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان کی جو کیفیت تسلیم و رضا تھی، وہ بھی بڑھ گئی۔ اور ان کا رویہ یہ
ہو گیا کہ ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''۔ ایمان میں اضافے کا ذکر سورۂ آل
عمران کی آیت ۱۷۳ میں بھی غزوۂ احد پر تبصرے کے دوران آیا ہے کہ: ﴿اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ
النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا﴾ ''(وہ مؤمنین
صادقین) جن سے لوگوں (مراد ہیں منافقین) نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑا لشکر آیا ہے لہٰذا
ان سے ڈرو، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا''۔ یہاں زَادَهُمْ ایمانِ حقیقی اور کامل سپردگی

میں اضافے کے لئے آیا ہے۔ لہٰذا ازروئے قرآن ایمانِ حقیقی کے بڑھنے کی نصوص ہمارے سامنے آ گئیں-اور جو چیز بڑھ سکتی ہے‘ وہ گھٹ بھی سکتی ہے۔

ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کا موضوع ہمارے منتخب نصاب میں ایمان حقیقی کے مباحث کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے آتا ہے۔ یہاں میں اجمالاً وضاحت پر اکتفا کروں گا۔ درحقیقت ایک قانونی ایمان ہے جو اِس دنیا میں ہمارے ایک دوسرے کو مسلمان سمجھے جانے کا سبب یا ذریعہ بنتا ہے۔ اس قانونی ایمان میں عمل سرے سے زیرِ بحث نہیں آتا‘ لہٰذا یہ قانونی ایمان نہ بڑھتا ہے‘ نہ گھٹتا ہے۔ اس کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بالکل درست ہے کہ اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ -''ایمان قول وقرار کا نام ہے‘ جو نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔'' اس ایمان کا دارومدار اقرار باللسان پر ہے اور تصدیقِ قلبی اس میں زیرِ بحث آ ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں ہے کہ کسی کے دل میں اتار کر دیکھ لیا جائے کہ ایمان حقیقی موجود ہے یا نہیں! اور کوئی جھوٹ موٹ کلمہ پڑھ رہا ہے یا سچ پڑھ رہا ہے؟ یہ قانونی ایمان کسی شخص کے اسلامی معاشرے کا فرد اور کسی اسلامی ریاست کا شہری بننے کی بنیاد بنتا ہے اور یہ ایمان نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے۔ جبکہ ایک ہے ایمانِ قلبی‘ یعنی ''تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ'' والا ایمان‘ جو دل میں ہوتا ہے۔ قانون اس سے بحث نہیں کرتا‘ لیکن آخرت میں ساری بحث اسی سے ہو گی۔ اللہ کو کسی کا قانونی مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی کوئی پرواہ نہیں ہے‘ یہ دُنیوی معاملہ ہے‘ دنیا میں اس بنیاد پر معاملات طے ہو چکے۔ اللہ کی نگاہ تو تمہارے دلوں پر ہے کہ یہاں ایمان ویقین ہے یا نہیں!۔ اس ضمن میں سورۃ الحجرات میں فرمایا کہ ﴿وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ ''ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے''۔ قلبی اور حقیقی ایمان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے۔ اس دل والے ایمان میں ''عمل'' ایک جزوِ لازم بن جائے گا۔ اس لئے کہ دل میں یقین ہو گا تو عمل میں اس کا ظہور لازماً ہو گا۔ اس اعتبار سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول صدفی صد درست ہے کہ اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَّعَمَلٌ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ۔ یعنی ایمان

قول وعمل کے مجموعے کا نام ہے‘ یہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔ یہ ضمنی بحث ﴿وَمَا زَادَھُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا﴾ کے ضمن میں آ گئی۔ ''اور اس چیز نے نہیں بڑھایا ان میں مگر ایمان اور تسلیم کو''۔

یہاں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے جو ایک قلبی کیفیت ہے اور ''تسلیم'' سے مراد ہے سپردگی وحوالگی۔ اسلام اور تسلیم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اسلام بابِ افعال ہے اور تسلیم بابِ تفعیل ہے۔ بابِ افعال کا خاصہ ہے کہ کوئی کام ایک دم ہو جائے‘ لہٰذا اسلام کا مطلب ہو گا فوری طور پر خود کو کسی کی سپردگی میں دے دینا اور بابِ تفعیل کسی کام کے پے در پے اور مسلسل ہونے کی خاصیت کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ تسلیم کا مفہوم ہو گا ہر دم‘ ہر وقت اور مسلسل اس سپردگی کی کیفیت کو قائم و برقرار رکھنا۔ جیسے ہی کسی نے اقرار کیا کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وہ دفعتہً کفر کی سرحد سے اسلام کی سرحد میں آ گیا۔ اس نے ایک پالے سے دوسرے پالے میں یکایک چھلانگ لگا دی اور وہ مسلمان ہو کر مسلم معاشرے کا فرد اور ایک مسلم ریاست کا شہری بن گیا۔ اس کو ایک مسلمان کے تمام حقوق حاصل ہو گئے۔ اور یہ بالکل برابر ہوں گے‘ ان میں کوئی کمی بیشی اس دنیا میں نہیں ہو گی۔ اسلام کی اس کیفیت کو وثوق حاصل ہو جائے گا اور اس کے طرزِ عمل میں مسلسل اطاعت شعاری اور فرماں برداری اور سپردگی کا مظاہرہ ہوتا رہے گا تو یہ تسلیم ہے۔ یہ مصرع اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے کہ ع ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' اور فارسی کا یہ شعر بھی اسی کیفیت کا مصداق ہے کہ

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

جواں مرد اہلِ ایمان کا ایفائے عہد

اگلی آیت میں فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ ۚ فَمِنْھُمْ مَّنْ قَضٰی

نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝﴾

''اہل ایمان میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی (اپنی باری آنے کا) منتظر ہے۔ اور انہوں نے (اپنے رویئے اور طرزِ عمل میں) کوئی تبدیلی نہیں کی''۔

کاش اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں شامل فرما دے!

یہ آیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر غزوۂ احزاب کے پس منظر میں غور و تدبر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ان اہل ایمان کی مدح و ستائش فرما رہا ہے کہ ان میں ایسے بھی جواں مرد اور باہمت لوگ ہیں جو اپنے عہد کو پورا کر چکے۔ یہاں رِجَالٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو رَجُلٌ کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواتین اس سے خارج ہو گئیں۔ قرآن حکیم میں اہل ایمان کو بالعموم مذکر کے صیغے میں خطاب کیا گیا ہے۔ ایسا بغرضِ تغلیب ہوتا ہے اور اس میں آپ سے آپ خواتین بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہاں لفظ ''رِجَال'' اپنی اس معنویت کے لئے آیا ہے کہ اس دنیا میں شیطانی وساوس سے بچ کر دین پر کاربند رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے' بلکہ بڑی ہمت اور جواں مردی کا کام ہے۔ یہی مضمون سورۃ النور کے پانچویں رکوع میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝﴾ (آیت ۳۷)

''ان میں ایسے باہمت و جواں مرد بھی ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آ جائے گی''۔

اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ یہ کیفیات عورتوں میں نہیں ہو سکتیں۔ خواتین میں صحابیات ہیں' اُمہات المؤمنین ہیں' رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین۔ پھر بڑی بڑی متقی' صالح' صابر' عابد و زاہد اور مجاہد خواتین اُمت میں پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں ایک اللہ والی

خاتون حضرت خنساء (رضی اللہ عنہا) بھی ہیں' جن کے چار جوان بیٹے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایران کی جنگ قادسیہ میں شہید ہو گئے اور انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ ایک خاتون وہ بھی ہیں کہ جب غزوۂ اُحد میں عارضی ہزیمت ہوئی اور نبی اکرم ﷺ کی شہادت کی افواہ مدینہ تک پہنچی تو وہ بے تابانہ میدانِ اُحد میں آتی ہیں۔ ان کو خبر دی جاتی ہے کہ تمہارے والد شہید ہو گئے' مگر وہ پوچھتی ہیں کہ یہ بتاؤ کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا شوہر بھی شہید ہو گیا۔ وہ کہتی ہیں کہ کوئی بات نہیں' مجھے یہ بتاؤ کہ حضور ﷺ کا کیا حال ہے؟ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا۔ وہ اللہ کی بندی کہتی ہیں کہ مجھے حضور ﷺ کے بارے میں بتاؤ۔ اور جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ بخیریت ہیں تو وہ کہتی ہیں: الحمد للہ! اس خوشخبری کے آگے سب کچھ ہیچ ہے۔ باپ' شوہر اور بیٹا تو مرتبۂ شہادت پر فائز ہو کر کامران و کامیاب ہو گئے۔ الغرض ہماری تاریخ میں ایسی خواتین کی بے شمار نظائر موجود ہیں۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ؎

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد
نہ ہر زن زن است و نہ ہر مَرد مَرد

چنانچہ اس بات کو اس مقام پر ذہن میں رکھئے کہ یہاں رجال سے جواں مرد و باہمت لوگ مراد ہیں' خواہ وہ مرد ہوں خواہ عورتیں۔

ان آیات سے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ بندۂ مؤمن کی زندگی کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف اللہ کے ساتھ دلی تعلق اور لگاؤ اور اس میں ثبات' اور دوسری طرف اللہ کے دین کے لئے جہاد و مجاہدہ اور اس میں صبر و ثبات اور استقلال و استقامت۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ میں' جو آیۂ برّ کے نام سے ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے' برو تقویٰ کی حقیقت کے ضمن میں ارشاد ہوا کہ اللہ کے نزدیک صادق اور نیک لوگ وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں' اور جب کوئی عہد و معاہدہ کرتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں' اور اللہ کی راہ میں تنگی اور

مصیبت نیز جہاد و قتال کے موقع پر انتہائی صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں۔ ایک بندۂ مؤمن کی زندگی کے یہ دو رُخ ہیں اور ان دونوں کے اعتبار سے انتہائی صبر و استقلال کی ضرورت ہے' لہٰذا یہاں فرمایا: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ ''اہل ایمان میں وہ جواں مرد اور باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اس عہد کو جو انہوں نے اپنے اللہ سے کیا تھا''۔

اب غور کیجئے کہ یہ عہد کون سا ہے؟ اسلام خود ایک بہت بڑا عہد ہے۔ پھر ہم نماز کی ہر رکعت میں اس کا اقرار اور اس کی تجدید کرتے ہیں کہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ اللہ کے ساتھ اس سے بڑا عہد ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور صرف تجھ ہی سے طالبِ اعانت و دستگیری ہیں اور رہیں گے۔ ہم نے اپنا سب کچھ تیرے سپرد اور تیرے حوالے کر دیا ہے۔ ع سپردم بہ تو مایۂ خویش را! از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ ''بلاشبہ اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں''۔ اب انہیں اس سودے میں پورے اتر کر دکھانا ہے۔ کہنے کو کہہ دیا' پڑھنے کو پڑھ لیا' سننے کو سن لیا' لیکن پورا اتر کر دکھانا قیامت ہے۔ کہنے کو تو شاعر نے بھی کہہ دیا کہ ؎

جان دی ' دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

لیکن اس پر پورا اترنا کوئی آسان بات نہیں۔ پس یہاں ان اہل ایمان کی مدح و ستائش ہو رہی ہے جنہوں نے اس آزمائش و ابتلاء میں اپنے آپ کو پورا تول کر دکھا دیا۔ لہٰذا ان کی شان میں فرمایا: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ آگے فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾ ''پس ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے'' یعنی اللہ کی راہ میں جان دے کر سرخرو اور سبک دوش ہو گئے۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ ''اور ان میں وہ بھی ہیں جو منتظر ہیں۔'' وہ اس بات کے

منتظر ہیں کہ کب وہ وقت آئے جب ہم اپنے اس عہد کو پورا کر کے سرخرو ہو جائیں اور اپنے شانوں پر رکھا ہوا بوجھ اتروا کر سبک دوش ہو جائیں۔ اگر گردن کٹ گئی تو شانوں کا بوجھ اتر گیا اور سبک دوشی حاصل ہو گئی۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ سَاَلَ اللّٰهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَاِنْ مَاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ)) (مسلم' کتاب الامارۃ)

''جو شخص صدق دل سے اللہ سے شہادت طلب کرتا رہے گا تو چاہے اس کی موت بستر پر واقع ہو اللہ تعالیٰ اسے شہداء کے مراتب تک پہنچا دے گا''۔

یہ اصل میں يَنْتَظِرُ والی کیفیت کی ایک طرح کی شرح ہے۔ البتہ اس انتظار کی کیفیات اور شرائط ہوں گی۔ قتال کا مرحلہ کیسے آئے گا جبکہ آپ نے جہاد ہی کی کوشش شروع نہیں کی؟ اگر آپ نے دین کے لئے محنت و مشقت کے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا' آپ اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کرنے والی کسی تنظیم و جماعت سے وابستہ ہی نہیں ہوئے تو پھر قتال کا مرحلہ کہاں سے آ جائے گا جو جہاد کی آخری اور چوٹی کی منزل ہے؟ یہ مرحلہ تو اُس وقت آ سکے گا جب آپ کسی ایسی منظّم دعوت اور تحریک سے عملاً وابستہ ہوں جو اقامت دین کے لئے کوشاں ہو۔ غور کیجئے ایسے صحابہ کرامؓ بھی تو ہیں جن کا ہجرت سے قبل انتقال ہو گیا' لیکن وہ دعوت و تبلیغ اور تکبیر رب میں نبی اکرم ﷺ کے دست و بازو رہے ہیں۔ اپنی جانیں' اپنا مال' اپنے اوقات' اپنی توانائیاں اور اپنی صلاحیتیں لگاتے رہے ہیں' کھپاتے رہے ہیں۔ وہ اگر غزوۂ بدر یا اُحد تک پہنچ گئے ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ ان کے قدم پیچھے ہٹ جاتے! اُن کا سابقہ طرزِ عمل ثابت کرے گا کہ وہ اپنے موقف میں کتنے ثابت قدم اور سرگرم عمل رہے ہیں۔ جو شخص قدم قدم پر پیچھے ہٹ رہا ہو اور پیسے پیسے کو سینت سینت کر رکھ رہا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اگر کبھی وقت کا تقاضا ہو تو وہ جان و مال کی بازی لگا دے گا؟ — پس جو بندۂ مؤمن صدقِ دل سے شہادت کا طالب ہو اور اللہ کی راہ میں نذرِ جاں پیش کرنے کا آرزومند ہو اُس کی

زندگی میں اس کے عملی مظاہرے آ کر رہیں گے۔ اگر وہ جہاد فی سبیل اللہ کی وادی میں قدم رکھ چکا ہے اور شہادت کا طلبگار بھی ہے تو وہ اس بات کی توقع رکھے کہ اگر بستر پر بھی اس کی موت آئے تو اسے مرتبۂ شہادت مل سکے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جس نے کاغان کا سفر شروع کیا ہے تو اس کے لئے بابوسر پاس تک بھی پہنچنے کا امکان ہوگا۔ لیکن اگر کوئی بالاکوٹ سے آگے بڑھنے اور وادیٔ کاغان میں قدم رکھنے کے لئے ہی تیار نہیں تو بابوسر پاس کب آئے گا؟ بیٹھے بیٹھے بابوسر پاس کی تمنا کرتے رہنا تو سوائے اپنے آپ کو دھوکا دینے کے اور کچھ نہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ع خود را بہ فریبد کہ خدا را بہ فریبد — ایسا شخص خود اپنے آپ کو فریب دے رہا ہے یا خدا کو فریب دے رہا ہے؟— علامہ اقبال مرحوم نے خوب کہا ہے کہ ؎

خبر نہیں نام کیا ہے اس کا' خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

تو اس دھوکے کے انداز میں شہادت کی تمنا نہ ہو بلکہ عمل کے ساتھ صدقِ دل سے یہ تمنا ہو تو بستر کی موت بھی ان شاء اللہ شہادت کی موت ہوگی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موت بستر پر آئی ہے جن کی زندگی ہمیشہ جنگوں کے اندر بیتی ہے۔ اس میں یہ حکمت بھی ہوسکتی ہے کہ آنجنابؓ کو بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے ''سَیْفٌ مِنْ سُیُوفِ اللّٰہِ'' کا خطاب ملا تھا۔ لہٰذا ان کی شہادت گویا اللہ کی تلوار ٹوٹنے کے مترادف ہوتی۔ آپؓ کو شہادت کی موت کی بڑی تمنا تھی اور اسلام لانے کے بعد آپؓ کی زندگی جہاد و قتال میں گزری ہے۔ اگرچہ ان کی شہادت کی آرزو بظاہر پوری نہیں ہوئی لیکن نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ بالا قول مبارک اور نوید کے مطابق ان کی بستر کی موت بھی شہادت کی موت ہے۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا ﴾ ''انہوں نے اپنے رویئے میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی''۔ ''تَبْدِیْلًا'' یہاں مفعول مطلق کے طور پر آیا ہے اور اس میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ان اہل ایمان نے بالکلیہ اپنے عہد اور وعدے کو ایفاء کیا اور اس میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی' بلکہ اس کو پوری طرح نبھایا۔ اور یہ

جان لیجئے کہ ہمارے اور اس معاشرے میں بڑا بنیادی فرق یہی تھا۔ وہ عہد کے سچے تھے اور ہم عہد کرتے ہیں تو اس کا ایفاء نہیں کرتے' اس کو نبھاتے نہیں۔ ابھی عہد کریں گے اور ہاتھ میں ہاتھ دیں گے لیکن دو دن کے اندر اس کو توڑ دیں گے۔ یہ جو ہمارے کردار میں گھن لگ گیا ہے' اس کے سبب سے ہماری شخصیتیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ جبکہ اُس معاشرے کی کیفیت یہ تھی کہ ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے تو ہر چہ بادا باد' عہد کو بہرصورت ایفاء کرنا اور نبھانا ہے' پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال نہیں۔

یہ کردار اُس معاشرے میں ایامِ جاہلیت میں بھی موجود تھا۔ لوگ بڑی زیادتی کرتے ہیں کہ اُس دور کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ جیسے اُس معاشرے میں ظہورِ اسلام سے قبل سرے سے کوئی خیر تھا ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے سے بہت سے اعتبارات سے وہ معاشرہ کہیں بہتر تھا۔ ان کے ہاں اگر کوئی دشمن بھی مہمان کے طور پر مقیم ہو گیا' چاہے وہ باپ کا قاتل ہے' تو اس پر آنچ نہیں آئے گی اور اس حالت میں انتقام نہیں لیا جائے گا۔ جسے بھائی کہہ دیا اس کے لئے جان و مال سب حاضر ہے۔ جس کو پناہ دے دی ہے اس کے لئے پورے قبیلے کی مخالفت گوارا کر لی جائے گی اور اس کی مدافعت میں اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ وہاں حال یہ تھا کہ اگر کسی کی اطاعت قبول کر لی ہے تو اب اس اطاعت سے کبھی سرتابی نہیں کی جائے گی۔ یہ بنیادی کردار ہوتا ہے۔ ہم اِس وقت جن اسباب کی بنا پر دنیا میں ذلیل و رسوا اور پامال ہو رہے ہیں' ہمارا کوئی وقار نہیں ہے' کوئی باعزت مقام ہمیں حاصل نہیں ہے تو اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہمارا کردار پست ہو چکا ہے اور ہم' الا ماشاء اللہ' بنیادی اخلاقیات سے بھی تہی دست ہو چکے ہیں۔ ہمارے کردار میں پختگی نہیں ہے' بلکہ انتہائی بودا پن موجود ہے۔ عہد کر کے نبھانے اور اس کو وفا کرنے کی خو اور ارادہ نہیں ہے۔ جھوٹے وعدے ہم کرتے ہیں اور اچھے اچھے اور بڑے بڑے سمجھدار لوگ اس کمزوری میں مبتلا ہیں۔ یہ ہمارے کردار کی ناپختگی اور بودے پن کا بہت بڑا سبب ہے۔

ہمارے دین میں ایفاءِ عہد کی جو اہمیت ہے اس کا تفصیل سے ذکر ہمارے منتخب

نصاب میں متعدد بار آتا ہے۔ جیسے آیۂ بر (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۷) کے درس میں اہل بر وتقویٰ کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے: ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع کے درس میں بیان ہوتا ہے: ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً ﴾ اسی طرح سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع کی آیت ۸ اور سورۃ المعارج کے پہلے رکوع کی آیت ۳۲ میں ایک شوشے کے فرق کے بغیر امانت اور عہد کے متعلق مؤمنینِ صالحین کے اوصاف کے ضمن میں آتا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ﴾ ''اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پوری طرح حفاظت کرنے والے ہیں'' (وہی فلاح یافتہ ہیں)۔ یہ ہے کردار کی اہم ترین بنیاد کہ اہل ایمان اپنے عہد و پیمان اور قول وقرار کو وفا کرنے والے اور ان کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں۔

ان مؤمنین صادقین کی اس استقامت و مصابرت کا جو نتیجہ نکلا اس کو اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾ ''تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے''۔ یہاں لام' لامِ عاقبت ہے' یعنی کسی کام کا جو نتیجہ نکلتا ہے' اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ میں نے اس صورت حال کے متعلق آپ کو بتایا تھا کہ یہ کڑا امتحان اس لئے لیا گیا تھا کہ جدا کر کے اور نمایاں کر کے دکھا دیا جائے کہ کون لوگ مؤمنینِ صادقین ہیں' کون لوگ ضعفِ ایمان میں مبتلا ہیں اور کون لوگ منافقین ہیں! یہی تو تمیز کرنی تھی' اور یہ تمیز اس لئے تھی کہ ﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾

دین میں 'صدق' کا مقام ومرتبہ

یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ ہمارے دین میں صدق کا کیا مقام اور مرتبہ ہے۔ آیۂ بر میں نیکوکاروں کے متعدد اوصاف بیان کر کے آخر میں فرمایا گیا:

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾

''(حقیقی نیکوکار تو وہ لوگ ہیں) جو تنگی اور مصیبت کے وقت اور حق و باطل کی

جنگ میں صبر کرنے والے ہوں' یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں' اور یہی لوگ درحقیقت متقی ہیں۔''

سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۹ میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾

''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں میں شامل ہو جاؤ۔''

صدیقین کے اوصاف میں سے چوٹی کے دو اوصاف یہ ہیں کہ وہ ہر حال میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والے اور مصیبت و ابتلاء میں اور میدانِ قتال و وَغا میں استقامت و مصابرت کا مظاہرہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی لئے سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں منعم علیہم کی فہرست میں نبیین کے بعد صدیقین ہی کا رتبہ اور مقام بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ﴾

''جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے' یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔''

اس صدق کی بنیاد یہی ہے کہ قول میں سچے ہوں' وعدوں میں سچے ہوں' عمل میں سچے ہوں۔ اگر راست گفتاری نہیں ہے' راست بازی نہیں ہے' راست کرداری نہیں ہے تو نہ تقویٰ ہے اور نہ نیکی ہے۔ اس کے بغیر دین کا ڈھانچہ بے جان اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ بے وقعت و بے روح ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسے معاشرے کے افراد صرف نمائشی پہلوان ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بھی دین محض بطورِ نمائش شامل ہے' اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ معاشرہ صدق کی دولت سے تہی دامن اور تہی دست ہے۔ یہ پونجی اور یہ سرمایہ اس کے پاس سے نکل چکا ہے اور اس پہلو سے وہ بالکل دیوالیہ ہو چکا ہے۔ الا ماشاء اللہ' کچھ لوگ ہوں گے جن کے پاس کچھ پونجی موجود ہو۔ حالانکہ ہمارے دین کا شدید ترین مطالبہ یہ ہے کہ جو کہہ رہے ہو اس کو عمل سے سچ کر دکھاؤ' جو تمہارے اندر ہے وہی باہر

لاؤ۔ چنانچہ سورۃ الصّف میں، جو ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے، دوٹوک انداز میں فرمادیا گیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۞ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۞ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۞﴾

''اے اہلِ ایمان! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ حرکت سخت ناپسندیدہ اور بیزارکن (اور اس کے غضب کا باعث) ہے کہ تم وہ بات کہو جس کے مطابق تمہارا عمل نہیں۔ اللہ کو تو وہ اہلِ ایمان محبوب ہیں جو اُس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر مقابلہ کرتے ہیں جیسے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

یہ ہے دراصل صدق کی بنیاد۔ صدق قول کا بھی ہے، صدق عمل کا بھی ہے، صدق انسان کی سیرت و کردار کا بھی ہے۔ صدق بوقت ضرورت اللہ کی راہ میں نقد جان کا نذرانہ پیش کرنا بھی ہے۔ اب ان آیات میں صدق کی اہمیت دیکھئے۔ فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا ۞ لِیَجْزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ وَیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۞﴾

''اہلِ ایمان میں وہ باہمت لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری کا منتظر ہے۔ (یہ اس لئے ہوا) تاکہ اللہ مؤمنین صادقین کو ان کی سچائی کی جزا دے۔ اور منافقین کو اگر چاہے تو سزا دے یا اگر چاہے تو (ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمادے اور) ان کی توبہ قبول فرمالے۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے''۔

منافقین کے بارے میں تدریجی احکام

غزوۂ احزاب ۵ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ یہ زمانہ مدنی دور کا وسط ہے۔ منافقین کے

باب میں آپ کو قرآن مجید میں یہ تدریج نظر آئے گی کہ شروع میں یعنی سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران میں لفظ نفاق آیا ہی نہیں۔ صرف اس مرضِ نفاق کی علامات ظاہر کی گئیں۔ سورۃ النساء میں لفظ نفاق کے ساتھ سخت لہجہ اور اسلوب میں گفتگو شروع ہوتی ہے۔ یہاں یہ معاملہ ہے کہ منافقین کا کردار تو واضح اور نمایاں طور پر بیان کر دیا گیا ہے، لیکن ان کے رویئے کے متعلق آخری فیصلہ ابھی نہیں سنایا گیا تاکہ اگر کسی کے اندر اصلاح پذیری کا کوئی مادہ اور رمق موجود ہے تو وہ اصلاح کر لے۔ کوئی اگر نفاق کی حالت سے لوٹ سکتا ہے تو لوٹ آئے۔ کوئی اگر ایمانِ حقیقی کی طرف رجوع کر سکتا ہے تو کر لے، دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔ لیکن آگے جا کر اس ضمن میں آخری احکام اور فیصلے آئے ہیں، جن میں سے ایک فیصلہ تو سورۃ النساء میں شامل کیا گیا کہ: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ۞﴾ (آیت ۱۴۵) ''یقیناً منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے، اور تم کسی کو اُن کا مددگار نہ پاؤ گے''۔ اور سورۃ التوبہ (البراءۃ) میں جو ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی، مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے، ان منافقین کی اصل حقیقت کھول کر یہ فیصلے صادر فرمادیئے گئے کہ:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ هِیَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ۞﴾ (آیت ۶۸)

''منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں کے لئے اللہ نے آتشِ دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ان کے لئے موزوں ٹھکانہ ہے۔ ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لئے قائم و دائم رہنے والا عذاب ہے۔''

آگے یہاں تک فرمادیا کہ:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۞﴾ (آیت ۸۰)

''(اے نبیؐ!) آپ خواہ ایسے لوگوں کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں، اگر

آپؐ ستر بار بھی ان کو معاف کر دینے کی درخواست کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا' اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے' اور اللہ فاسقوں کو راہ یاب نہیں فرماتا۔''

حضور ﷺ کا اپنا مزاج ہے۔ آپؐ رؤف بھی ہیں اور رحیم بھی۔ لہٰذا آپ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ستر سے زیادہ بار استغفار کرنے سے ان کی مغفرت ہوسکتی ہے تو میں کرتا۔ نبی اکرم ﷺ کے اس قول کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ یہاں ستر سے مراد عدد یا ہندسہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک استعارہ ہے۔ یہاں ستر کا لفظ کثرت کے لئے آیا ہے کہ اب ان کے لئے توبہ کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ ان کو بار بار متوجہ کیا گیا۔ تقریباً دس سال بیت گئے۔ ان کو اصلاح کا پورا پورا موقع دیا گیا۔ اس مقام پر ہی دیکھ لیجئے کتنے پیارے انداز میں فرمایا گیا: ﴿وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴾ مؤمنینِ صادقین کے لئے تو قطعیت کے ساتھ فرمایا گیا: ﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾ لیکن منافقین کے لئے توبہ کرنے اور اپنے رویئے کی اصلاح کرنے کا موقع رکھا گیا اور ان کو مہلت دی گئی کہ ابھی ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ فیصلے کا وقت نہیں آیا ہے' ابھی ان کے لئے راستہ کھلا رکھا گیا ہے۔ چونکہ ان کے لئے توبہ کا دروازہ ابھی کھلا رکھا گیا تھا لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت غفوریت اور رحمانیت کا بیان فرما دیا تاکہ منافقین بالکل مایوس نہ ہو جائیں۔ گویا ان کو دعوت دی جا رہی ہے کہ آؤ' لوٹو اور رجوع کرو۔

باز آ باز آ آں ہرچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ!
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اب آگے چلئے۔ فرمایا: ﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا﴾ اور ''اللہ نے کفار کا مُنہ پھیر دیا اور وہ اپنے دل کی جلن اور غصہ وغیظ لئے یونہی پلٹ گئے اور ان کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا''۔ غور کیجئے کہ ان کفار کو کن کن حسرتوں کا مُنہ دیکھنا پڑا ہوگا۔

کیسے کیسے ساز و سامان کے ساتھ اور کیسی کیسی سازشوں کے نتیجے میں اتنی مختلف سمتوں سے لشکروں کا ایک جگہ آ کر جمع ہو جانا! اس کے لئے انہوں نے کیا کیا کھکھیڑ مول نہیں لئے ہوں گے؟ کتنی سفارتی بھاگ دوڑ اور چلت پھرت ہوئی ہوگی۔ کتنے ایلچی آئے اور گئے ہوں گے۔ کتنے پروگرام بنے ہوں گے! وہ کوئی ٹیلی کمیونیکیشن کا دور تو نہیں تھا۔ اُس زمانے کے عرب میں اس حملے کی تیاری اور پروگرام بنانے کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے گئے ہوں گے' ذرا ان کا تصور تو کیجئے! لیکن ان کے متحدہ محاذ اور اُن کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے خیمے اکھاڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس پر ان کے دلوں میں غیظ و غضب کی جو آگ سلگ رہی تھی اس پر اللہ تعالیٰ تبصرہ فرما رہا ہے: ﴿وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو ان کے غیظ و غضب سمیٹ لوٹا دیا' اب وہ اس میں سلگیں اور جلیں' گویا ان کے دل آگ کی بھٹی بنا دیئے گئے —— وہ کوئی خیر نہ پا سکے' کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے اور کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ بغیر اس کے کہ اپنے مقاصد میں سے کچھ بھی انہیں ملا ہوتا' وہ ناکام اور خائب و خاسر ہو کر لوٹا دیئے گئے۔

اسی آیت میں آگے فرمایا: ﴿وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ﴾ ''اور اللہ کافی ہو گیا اہلِ ایمان کی طرف سے قتال کے لئے۔'' قتال کا تو موقع ہی نہیں آیا۔ خندق میں جو کوئی بھی کودا مبارزت طلبی کے بعد واصل جہنم ہوا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا! سیرتِ مطہرہ کی کتب میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے پوری کوشش کی تھی لیکن انہیں خندق میں لشکر اتارنے کی ہمت نہیں ہوئی' کیونکہ مسلمان تیر اندازوں نے اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے ان کو ہزیمت پر مجبور کر دیا۔ لہٰذا اس غزوے میں دوبدو گھمسان کی جنگ' جیسے بدر اور اُحد میں ہوئی' کا تو موقع ہی نہیں آیا۔ یہ جنگ تو اللہ نے مسلمانوں کے لئے جیت لی۔ اصل میں تو مسلمانوں کا امتحان مقصود تھا' وہ ہو گیا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا' یعنی اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق جدا جدا ہو کر نمایاں اور ممیّز ہو گئے۔ بس یہی مطلوب تھا۔ اب کفار کے لشکروں کے منہ موڑنے کے لئے اللہ کافی ہو گیا۔

یہ آیت مبارکہ اس پُر جلال و پُر ہیبت اسلوب سے ختم ہوتی ہے کہ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ

قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴾ ”اللہ بڑی قوت والا زبردست ہے“۔ اس سے پہلے کی آیت میں در توبہ وا رکھا گیا تھا لہٰذا وہاں صفات کون سی آئیں؟ ﴿غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ آیات کے آخر میں بالعموم اللہ کی جو صفات یا اسماءِ حسنیٰ آتے ہیں، ان کا مضمون سے گہرا ربط وتعلق ہوتا ہے، ان پر سے سرسری طور پر گزرنا نہیں چاہئے۔ یہاں دو صفات کی وساطت سے بتایا جارہا ہے کہ اللہ بڑی قوت والا اور زبردست اختیار واقتدار رکھنے والا ہے۔ اس کی ذاتِ والا صفات فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے، وہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ پورے عرب کے مشرک قبائل اور یہود کے دو قبیلے متحدہ محاذ بنا کر اسلامی تحریک کو بالکلیہ نیست ونابود کرنے کے لئے مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ لیکن تقریباً ایک ماہ کے طویل محاصرے کے بعد قدرتِ الٰہی کا کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ ایک رات سخت آندھی آئی جس میں سردی، کڑک اور چمک تھی اور اتنا اندھیرا تھا کہ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا نقشہ تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آندھی نے دشمنوں کے خیمے تلپٹ کر دیئے تھے اور ان کے اندر شدید افراتفری مچ گئی تھی۔ مشرکین عرب کا یہ متحدہ محاذ قدرتِ الٰہی کا یہ کاری وار سہہ نہ سکا اور صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح جب مسلمان اٹھے تو میدان خالی تھا جس کو دیکھ کر نبی اکرم ﷺ نے یہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے تھے: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ)) ”اب قریش تم پر کبھی چڑھائی نہ کر سکیں گے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے۔“

غزوۂ بنو قریظہ ۔ غزوۂ احزاب کا ضمیمہ وتتمہ

آگے چلئے! غزوۂ احزاب کا جو ضمیمہ اور تتمہ ہے، یعنی غزوہ بنی قریظہ، اس کا نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اس رکوع کی آخری دو آیات میں ذکر ہے۔ سیرت کی کتابوں میں اس کو علیحدہ عنوان کے تحت بیان کیا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید میں اس کا ذکر یہاں غزوۂ احزاب کے ضمن میں ایک Appendix کے طور پر کیا گیا ہے

ان دو آیات کے مطالعے سے قبل رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت

مدینہ منورہ میں یہود کے جو تین قبائل آباد تھے ان کے متعلق تھوڑا سا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجئے۔ یہ قبیلے تھے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ نبی کریم ﷺ کا کمال تدبر یہ تھا کہ مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد آپؐ نے ان تینوں قبائل کو ایک معاہدے کا پابند کر لیا تھا۔ حضورؐ کی اس کمالِ فراست کو میں جو بھی خراجِ تحسین پیش کروں گا، وہ عقیدت میں شمار ہو سکتا ہے، لیکن اس تدبر و فراست پر مستشرقین کمال درجہ کا خراجِ تحسین پیش کر چکے ہیں۔ وہ ایچ جی ویلز ہوں، منٹگمری واٹ ہوں یا دوسرے مستشرقین ہوں، انہوں نے حضورؐ کے کمال تدبر اور پیش بینی کی جو مدح سرائی کی ہے، وہ کافی ہے۔ اصل تعریف وشہادت تو وہ ہے جو اَعداء دیں۔ مدینہ میں بسنے والے اوس وخزرج کے اکثر لوگ ایمان لے آئے تھے۔ یہی دو قبیلے اصلاً مدینہ کے رہنے والے تھے، جبکہ یہود باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ اوس وخزرج کی دعوت پر ہی باذنِ الٰہی حضور ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی تھی اور یہاں تشریف آوری کے بعد آپؐ کی حیثیت مدینہ کے امیر، حاکم اور مقتدر اعلیٰ کی ہوگئی۔ آپؐ نے ان یہودی قبائل کو اس معاہدے میں جکڑ لیا کہ اگر باہر سے مدینہ پر کوئی حملہ آور ہوا تو سب مل کر دفاع کریں گے۔ یہ معاہدہ تھا جو یہود کے گلے کا طوق بن گیا۔ یہ معاہدہ نہ ہوتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ واللہ اعلم!

اپنی جگہ پر ایک دوسری بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مسلمان قوم جب بگڑتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے اندر ”وھــــن“ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لفظ ”وھــــن“ کی حضور ﷺ نے تشریح یوں فرمائی ہے کہ: حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ ۔ یعنی اس قوم میں دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ دشمن کے مقابلہ میں کمزور ہو جاتی ہے۔ یہود اُس وقت کی بگڑی ہوئی مسلمان قوم تھی۔ ان کے اندر وہ ضعف تھا کہ سورۃ الحشر میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا: ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ۭ﴾ ”(اے مسلمانو!) یہ یہود کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے، لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں

بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔'' ان یہودیوں کے برعکس مشرکین نے کھلے میدانوں میں آ کر جنگ کی ہے۔ ابوجہل نے غزوۂ بدر میں اپنے معبودانِ باطل اور اپنے اوہامِ باطلہ کے لئے دوبدو ہوکر میدانِ جنگ میں گردن کٹوائی۔ لیکن یہود کا معاملہ یہ ہے کہ جب لڑیں گے تو فصیلوں پر چڑھ کر عورتوں کی طرح پتھراؤ کریں گے۔ پھر یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں' ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ﴾ (آیت ۱۴) تم ان کو اکٹھا سمجھتے ہو' حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تم ان سے گھبراؤ نہیں۔ بظاہر ان کی جمعیت بہت مرعوب کن ہے' یہ بہت پیسے والے ہیں' ساز وسامان بھی ان کے پاس وافر موجود ہے' اسلحہ بھی ان کے پاس بہت ہے' ان کے پاس گڑھیاں ہیں' قلعے ہیں۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ یہ اندر سے اتنے بودے تھے کہ ان میں میدان میں آ کر لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ پھر ان تمام کمزوریوں کے علی الرغم نبی اکرم ﷺ نے ان کو معاہدے میں جکڑ لیا تھا۔

اب یہ ہوا کہ یہ مختلف مواقع پر اس معاہدے پر تلملاتے رہے۔ ان میں سب سے زیادہ شجاع بنوقینقاع تھے۔ آہن گری اور زرگری کے پیشے کے اعتبار سے ان کے پاس پیسہ بھی تھا اور سامانِ حرب اسلحہ وغیرہ بھی کافی تھا۔ غزوۂ بدر کے بعد سب سے پہلے ان کی طرف سے نقضِ عہد ہوا اور اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی۔ حضور ﷺ نے فوراً اقدام فرمایا اور ان کو مدینہ بدر ہونا پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے ساتھ بڑی رعایت برتی' ان کو اپنا تمام ساز وسامان لے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اونٹوں پر اپنا تمام اسباب لاد کر گاتے بجاتے ایک جشن کی صورت میں مدینہ سے نکلے۔ یہ پہلا معاملہ تو ۲ھ میں بدر کے بعد بنوقینقاع کے ساتھ ہوگیا۔ غزوۂ اُحد کے بعد یہی معاملہ بنونضیر کے ساتھ پیش آیا۔ اُحد میں مسلمانوں کی عارضی ہزیمت سے ان کے حوصلے بلند ہوگئے تھے اور یہ قبیلہ دلیر ہوکر مسلسل بدعہدیاں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے خود نبی اکرم ﷺ کو شہید کرنے کی سازش تک کر ڈالی۔ نبی اکرم ﷺ نے

اس قبیلے کو بھی مدینہ بدر کر دیا اور یہ دونوں قبیلے خیبر کے آس پاس جا کر آباد ہوگئے' جہاں یہودی پہلے سے آباد تھے اور انہوں نے بڑی مضبوط قلعہ بندیاں کر رکھی تھیں۔

اہل ایمان کے خلاف مشرکین عرب اور یہود کی مشترکہ سازشیں

ان دونوں قبیلوں کو اسلام اور حضور ﷺ سے دلی عداوت تو پہلے ہی سے تھی۔ مدینہ سے جلاوطنی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور یہ قبیلے خیبر میں بیٹھ کر مسلمانوں کے خلاف عرب کے مشرک قبائل کو بھڑکانے اور مدینہ پر چڑھائی کرنے پر اکسانے کے لئے مسلسل سازشیں کرتے رہے۔ ان کے سردار' ان کے شعراء اور ان کے خطیب مشرکین کے قبیلوں میں جا کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ چنانچہ ۵ھ میں غزوۂ احزاب میں ہر چہار سمت سے عرب کے مشرک قبائل نے مدینہ پر جو یلغار کی وہ انہی یہود کی سازش کا نتیجہ تھی اور اس یلغار کی نقشہ بندی میں بھی یہی یہودی پیش پیش تھے۔ اس موقع پر' جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' حملہ آور لشکریوں کی تعداد تقریباً بارہ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اتنی بڑی جمعیت اس سے قبل کبھی جمع نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ حملہ اچانک ہوتا تو سخت نقصان دہ اور تباہ کن ہوسکتا تھا۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ آپؐ کو دشمنوں کی نقل وحرکت کی برابر اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ آپؐ نے حضرت سلمان فارسی ؓ کے مشورے پر دفاع کے لئے جبلِ اُحد کے مشرقی اور مغربی گوشوں میں خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا۔ مدینہ کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ اسی طرف سے حملہ ہوسکتا تھا' بقیہ سمتوں میں قدرتی رکاوٹیں موجود تھیں۔ کفار ومشرکین اس طریقِ دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انہیں جاڑے کے موسم میں ایک طویل محاصرے کے لئے مجبور ہونا پڑا' جس کے لئے وہ تیار ہوکر اپنے ٹھکانوں سے نہیں آئے تھے۔

اب ان کے لئے ایک ہی چارۂ کار رہ گیا تھا کہ وہ بنوقریظہ کے یہودی قبیلے کو مدینہ منورہ پر جنوب مشرقی گوشے سے حملہ کرنے پر آمادہ کریں۔ چونکہ اس قبیلے سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ طے تھا کہ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ

مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کریں گے لہٰذا اس طرف سے بے فکر ہو کر مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ اس سمت میں دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا بلکہ اپنی عورتیں اور بچے بھی ان گڑھیوں میں بھجوا دیئے تھے جو بنوقریظہ کی جانب تھیں۔ کفار نے مسلمانوں کے دفاع کے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا اور انہوں نے بنوقریظہ کے سرداروں کے پاس سفارت بھیج کر ان کو غدّاری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اوّل تو وہ ہچکچائے کہ ہمارا محمد (ﷺ) سے معاہدہ ہے اور ہم کو ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ابتداء میں ان کا موقف یہی تھا، لیکن اس کے بعد حُیی بن اَخطب نے ان کو مزید دلائل دیئے کہ ''دیکھو میں عرب کی متحدہ قوت کو محمدؐ پر چڑھا لایا ہوں، اسلام کو ختم کرنے کا یہ آخری موقع ہے۔ اتنے بڑے لشکر آئندہ کبھی جمع نہیں ہو سکیں گے اور پھر ساری عمر ہم سب کو کف افسوس ملنا پڑے گا، کیونکہ پھر محمد (ﷺ) کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کر سکے گا۔'' ابنِ اخطب کی ان باتوں سے بنوقریظہ پر بھی معاہدے کی پاسداری اور اخلاقی اقدار کے لحاظ پر اسلام دشمنی غالب آ گئی اور وہ نقضِ عہد پر آمادہ ہو گئے۔

نبی اکرم ﷺ اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھے۔ آپ ﷺ کو پل پل کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ آپؐ نے انصار کے سرداروں میں سے حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ نیز دو اور حضرات (رضی اللہ عنہم) کو بنوقریظہ کے پاس بھیجا کہ جا کر تحقیق کر کے آئیں کہ صورت حال کیا ہے! ادھر خود اہل ایمان کے لشکر میں منافقین کا ففتھ کالمسٹ عنصر موجود تھا۔ وہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لئے خبریں پھیلا رہے تھے کہ اب بنوقریظہ کی جانب سے بھی حملہ ہوا چاہتا ہے، لہٰذا ہوش کے ناخن لو اور اپنے گھروں کی خبر لو جو جنوب مشرقی گوشے سے بنوقریظہ کی براہِ راست زد میں ہیں۔ آیت ۱۳ میں منافقین کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿یٰۤاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا﴾ ''اے یثرب کے لوگو! تمہارے لئے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، پس پلٹ چلو''۔ نبی اکرم ﷺ نے جن سرداروں کو بنی قریظہ سے گفت وشنید کے لئے بھیجا تھا، ان کو تاکید فرمائی تھی کہ اگر تم دیکھو کہ بنوقریظہ اپنے عہد پر قائم ہیں تو تم آ کر سارے

لشکر کے سامنے علی الاعلان خوش خبری دینا کہ یہ محض افواہ ہے، اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے، لیکن اگر وہ نقضِ عہد کا فیصلہ کر چکے ہیں تو صرف مجھے اشارۃً اس کی اطلاع دینا، عام لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے حوصلے مزید پست ہو جائیں۔ ان حضرات نے واپس آ کر حضور ﷺ کو اشارہ وکنایہ میں بنوقریظہ کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ اس لئے کہ بنوقریظہ کے سرداروں نے ان انصار سے برملا کہہ دیا تھا کہ لَا عَقْدَ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مُحَمَّدٍ وَلَا عَهْدَ ''ہمارے اور محمد (ﷺ) کے مابین کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔''

بنوقریظہ کی غداری اور نعیمؓ بن سعود کی حکمت عملی

غزوۂ احزاب میں سب سے زیادہ تشویشناک صورت بنوقریظہ کی اس غداری سے بنی تھی۔ اس لئے کہ نہ صرف اسلامی لشکر کا عقب محفوظ نہیں رہا تھا بلکہ وہ گڑھیاں اور مدینہ منورہ کا شہر بھی محفوظ نہیں رہے تھے جہاں صرف عورتیں اور بچے تھے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ قبیلہ غطفان کی شاخ اشجع سے ایک صاحب نعیم بن سعودؓ مسلمان ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں خفیہ طور پر حاضر ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ میرے اسلام قبول کرنے کا ابھی کسی کو علم نہیں ہے، آپؐ اِس وقت جو چاہیں مجھ سے خدمت لے سکتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ممکن ہو تو تم جا کر ان اَحزاب اور بنوقریظہ میں پھوٹ ڈالنے اور عدم اعتماد پیدا کرنے کی کوئی تدبیر کرو۔ چنانچہ انہوں نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ وہ پہلے بنوقریظہ کے پاس گئے جہاں ان کا پہلے ہی سے آنا جانا تھا اور وہ وہاں متعارف تھے اور ان کے سرداروں سے کہا کہ ''قریش اور غطفان کے قبائل تو محاصرے کی طوالت سے تنگ آ کر بغیر لڑے بھڑے واپس بھی جا سکتے ہیں، ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، لیکن تم کو یہیں رہنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں تمہارا کیا حشر ہوگا؟ اس کو بھی سوچ لو۔ میری رائے ہے کہ تم اُس وقت تک کوئی اقدام نہ کرنا جب تک باہر سے آئے ہوئے ان قبائل کے چند سربرآوردہ لوگ تمہارے پاس بطور یرغمال نہ ہوں۔'' بنوقریظہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور انہوں نے متحدہ محاذ کے قبائل سے یہ

مطالبہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر یہ صاحب قریش اور غطفان کے سرداروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ ''میں بنوقریظہ کے پاس سے آ رہا ہوں' وہ کچھ متذبذب معلوم ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ تم سے یرغمال کے طور پر چند آدمی طلب کریں اور پھر انہیں محمد (ﷺ) کے حوالے کر کے ان کے ساتھ از سرنو اپنا معاملہ استوار کرلیں' اس لئے ان کے ساتھ ہوشیاری سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔ سردارانِ لشکر یہ بات سن کر ٹھٹھک گئے۔ انہوں نے بنوقریظہ کو کہلا بھیجا کہ ہم اس طویل محاصرے سے تنگ آ گئے ہیں' اب ایک فیصلہ کن معرکہ ہونا ضروری ہے۔ کل تم اپنی سمت سے بھرپور حملہ کرو' ادھر سے ہم یکبارگی مسلمانوں پر یلغار کر دیں گے۔ بنوقریظہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جب تک آپ اپنے چند چیدہ آدمی بطورِ یرغمال ہمارے حوالے نہیں کریں گے' ہم جنگ کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ انہوں نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح دونوں فریق اپنی اپنی جگہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نعیم کی بات سچی تھی۔ نتیجتاً نعیم بن سعودؓ کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی اور دشمنوں کے کیمپ میں بداعتمادی اور پھوٹ پڑ گئی۔

بنوقریظہ کے خلاف اقدام کا فیصلہ

بنوقریظہ نے اگرچہ عملاً غزوۂ احزاب میں کوئی حصہ نہیں لیا— لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ فسخ کر چکے تھے اور انہوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ ''لَا عَقْدَ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مُحَمَّدٍ وَلَا عَھْدَ''۔ لہٰذا اب جب کہ غزوۂ احزاب اس معنی میں ختم ہوا کہ مشرکین عرب کے تمام لشکر محاذ چھوڑ کر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے تو نبی اکرم ﷺ اپنے ہتھیار اتار رہے تھے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ ''اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ ہتھیار اتار رہے ہیں جبکہ ہم نے ابھی ہتھیار نہیں اتارے ہیں۔ آپ فوراً تشریف لے جا کر بنوقریظہ کا محاصرہ فرمائیے۔ چنانچہ اسی وقت حضور ﷺ نے حکم دیا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز بنوقریظہ کی بستی میں پہنچنے سے قبل نہ پڑھے۔

اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث کے مابین اختلاف کی حقیقت

اب یہاں ایک اہم بات بھی لگے ہاتھوں بیان کر دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں جو دو مکاتیبِ فکر ہیں' یعنی اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث' ان کے مابین اصل اختلاف کیا ہے! وہ نوٹ کر لیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ کوئی مسلمان عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک بنی قریظہ پر نہ پہنچ جائے۔ معنی کیا تھے؟ یہ کہ جلد سے جلد پہنچو! اللہ کا حکم ہے' حضرت جبریلؑ نے آ کر بتایا ہے۔ پس جلد پہنچنے کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ عصر سے پہلے پہلے پہنچ جاؤ تاکہ ان کا معاملہ چکا دیا جائے۔ اب راستے میں صورت یہ پیش آ گئی کہ ایک ٹکڑی ابھی بنوقریظہ تک نہ پہنچ پائی تھی کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ لشکر مختلف ٹکڑیوں میں منزل کی جانب بڑھ رہا تھا' کئی میل کا سفر تھا۔ جس ٹکڑی کو راستہ ہی میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو نماز قضا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اب ان لوگوں کے مابین اختلاف پیدا ہوا۔ ایک فریق نے کہا کہ حضورؐ کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہاں پہنچے بغیر عصر مت پڑھو' بلکہ منشا یہ تھا کہ ہم عصر سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ لیکن اگر کسی وجہ اور مجبوری سے درمیان ہی میں عصر کا وقت ہو گیا ہے تو ہمیں نماز پڑھ لینی چاہئے۔ لیکن دوسرے فریق نے کہا کہ نہیں' جو حضور ﷺ نے فرمایا ہے ہم تو اسی کے مطابق عمل کریں گے۔ حضور ﷺ نے تو ''منشا'' بیان نہیں فرمایا' لہٰذا ہم تو رسول اللہ ﷺ کے الفاظ کی پیروی کریں گے اور عصر کی نماز بنوقریظہ کی بستی تک پہنچنے سے قبل نہیں پڑھیں گے' چاہے نماز قضا ہو جائے۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق عمل کر لیا۔ جب حضور ﷺ کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں نے صحیح عمل کیا۔

اب یہ ہے وہ حکمت جو محمد رسول اللہ ﷺ ہمیں تعلیم فرما گئے ہیں۔ لہٰذا خدارا بات کو کھلے دل سے سمجھئے اور خواہ مخواہ رائے' تعبیر اور اجتہاد کے اختلاف پر مستقل طور پر من دیگرم تو دیگری کا رویہ اختیار نہ کیجئے۔ یہ تفرقہ وحدتِ اُمت کے لئے سمِ قاتل ہے۔ ایک رویہ یہ ہے کہ حدیث کے جو الفاظ (letters) ہیں' ہم تو بالکل حرف بہ

حرف‘ ہو بہو‘ literally اُس پر عمل کریں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ علت کیا ہے‘ اور حکمت کیا ہے؟ وہ اللہ جانے اور اس کا رسولؐ جانے۔ اگر مسواک کا لفظ حدیث میں آیا ہے تو ہم تو مسواک ہی استعمال کریں گے۔ جبکہ دوسرا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ مسواک کرنے کی اصل غایت و علت دانت صاف رکھنا ہے‘ اگر ٹوتھ پیسٹ اور برش سے دانت صاف کر لئے تو مقصد پورا ہو گیا۔ اس طرح یہ دو مکاتیب فکر ہیں۔ ایک اصحابِ حدیث جو حدیث کے الفاظ کو جوں کا توں اختیار کرنے کو صحیح اور اقرب الی السنہ سمجھتے ہیں اور اسی طرزِ عمل میں عافیت خیال کرتے ہیں۔ دوسرے اصحاب الرائے ہیں جو غور و تدبر کرتے ہیں کہ کسی حدیث کی اصل حکمت کیا ہے‘ اس کی غرض و غایت کیا ہے! نبی اکرم ﷺ نے دونوں قسم کے طرز عمل کی تصویب فرمائی۔ یہ اللہ کا شکر اور اس کا کرم و فضل ہے کہ اس معاملے میں اس نے اپنے رسول ﷺ سے دونوں طرزِ عمل کی تائید کرا دی۔ اس لئے کہ دونوں کی نیت دراصل تعمیل حکم اور اتباع تھا۔ پس ہم کو بھی یہی رویہ اختیار کرنا چاہئے کہ دونوں attitudes کے لئے اپنے دل میں کشادگی پیدا کریں۔ عمل تو ایک ہی پر ہو گا‘ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ یا آپ الفاظِ ظاہر پر عمل کریں گے یا اس کی حکمت و علت معلوم کر کے اسے اختیار کریں گے۔ اجتہاد کی بنیاد بھی تو یہی ہے کہ اہلِ علم احکامِ شرعیہ کی علت تلاش کریں اور دیکھیں کہ درپیش مسئلہ میں علت کس درجہ کی مشترک ہے‘ اسی کے مطابق قیاس کر کے مسئلہ کا حل نکال لیا جائے— تو یہ طریق تھا اصحابِ فقہ کا‘ جن کو اصحاب الرائے بھی کہا گیا ہے اور اوّل الذکر طریقہ تھا اصحابِ حدیث کا۔ لیکن حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے دونوں مسلک حق ہیں۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس واقعہ میں دونوں فریقوں کی تصویب فرمائی۔ یہ واقعہ اسی غزوہ کے دوران پیش آیا تھا تو میں نے چاہا کہ اسے بھی آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ہر واقعہ میں ہمارے لئے رہنمائی ہے اور یہی حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے اکمل و اتم ہونے کی دلیل ہے— بہرحال یہ ایک ضمنی بحث تھی جو درمیان میں آ گئی۔ اب اصل موضوع کی طرف رجوع کیجئے۔

بنوقریظہ کا محاصرہ

بنوقریظہ کی گڑھیوں پر سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر بطور مقدمۃ الجیش پہنچا۔ بنوقریظہ یہ سمجھے کہ یہ ہمیں محض دھمکانے آئے ہیں۔ وہ اُس وقت تک تو بڑے طنطنے میں تھے۔ انہوں نے اپنے کوٹھوں پر چڑھ کر نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کی شان میں گستاخیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ لیکن جب نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں پورے اسلامی لشکر نے وہاں پہنچ کر ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا تو ان کے ہوش ٹھکانے آئے۔ انہوں نے عین آڑے وقت اور پرخطر حالات میں معاہدہ توڑ ڈالا تھا اور مدینہ کی پوری آبادی کو ہلاکت خیز خطرے میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس طرح انہوں نے پشت سے خنجر گھونپنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ یہ تو حضرت نعیم کی جنگی چال اور حکمت عملی تھی‘ جس سے وہ مات کھا گئے۔ ان کا جرم کسی طور پر بھی قابلِ عفو نہیں تھا اور ان کو قرار واقعی سزا ملنی چاہئے تھی۔

جب محاصرے کی شدت‘ جو دو تین ہفتے جاری رہی‘ ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تو انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈالنے اور خود کو نبی اکرم ﷺ کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم بنایا جائے‘ وہ ان کے متعلق جو بھی فیصلہ کریں وہ فریقین تسلیم کر لیں۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کو اس توقع پر حَکَم بنانے کی تجویز رکھی تھی کہ اوس اور بنوقریظہ کے مابین مدتوں سے حلیفانہ تعلقات چلے آ رہے تھے۔ ان کو امید تھی کہ وہ ان کا لحاظ کریں گے اور بنوقینقاع اور بنونضیر کی طرح ان کو بھی اپنے ساز و سامان اور مال و اسباب کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکل جانے کا فیصلہ کریں گے۔ حضرت سعدؓ کو خندق میں دشمنوں کا ایک تیر لگ گیا تھا اور وہ شدید زخمی تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے علاج معالجہ کے لئے مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگوا رکھا تھا۔ حضور ﷺ خود ان کی تیمارداری فرما رہے تھے اور آپؐ نے خود اپنے ہاتھ سے ان کے زخم کو داغا تھا۔ حضور ﷺ کو حضرت سعدؓ سے بہت محبت تھی۔ انصار میں دو سعد تھے۔ ایک سعدؓ بن معاذ جو قبیلۂ اوس کے رئیس تھے اور دوسرے

سعدؓ بن عبادہ جو قبیلۂ خزرج کے رئیس تھے۔ خود حضرت سعدؓ بن معاذ کو بھی نبی اکرم ﷺ سے انتہائی محبت تھی۔ ان کی بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح فدویت کی کیفیت تھی۔

حضرت سعدؓ بن معاذ کا تورات کے مطابق فیصلہ

حضرت سعدؓ بن معاذ ایک ڈولی میں بنوقریظہ کی بستی میں لائے گئے۔ حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا وہ عین یہود کی شریعت کے مطابق تھا' کہ بنوقریظہ کے تمام جنگ کے قابل مردوں کو قتل کر دیا جائے' عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ اس فیصلے میں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ حضرت سعدؓ اس غزوہ میں دیکھ چکے تھے کہ بنوقینقاع اور بنونضیر کو مدینہ سے نکل جانے دیا گیا تو وہ گرد و پیش کے سارے قبائل کو بھڑکا کر قریش کی سرکردگی میں تقریباً بارہ ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے۔ چنانچہ حیاتِ طیبہ کے دوران اجتماعی قتل اور سخت ترین سزا کا یہی ایک واقعہ ہوا ہے جو بنوقریظہ کے ساتھ ہوا۔ اگر یہ نبی اکرم ﷺ کو حَکَم تسلیم کر لیتے جو انتہائی رؤف اور رحیم تھے تو وہ شاید اس انجامِ بد سے بچ جاتے' لیکن مشیتِ الٰہی یہی تھی' اس لئے ان کی مت ماری گئی اور انہوں نے حضور ﷺ پر عدم اعتماد کیا۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' حضرت سعدؓ بن معاذ نے یہ فیصلہ عین تورات کے مطابق کیا تھا۔ بنوقریظہ اسی انجام کے مستوجب تھے' کیونکہ انہوں نے اس وقت جبکہ مسلمانوں کے لئے انتہائی کٹھن وقت تھا' عقب سے مسلمانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا ارادہ کیا تھا۔ چنانچہ جب مسلمان بنوقریظہ کی گڑھیوں میں داخل ہوئے تو ان کو پتہ چلا کہ جنگ احزاب میں حصہ لینے کے لئے ان غداروں نے ۱۵ سو تلواریں' تین سو زرہیں' دو ہزار نیزے اور ۱۵ سو ڈھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید شاملِ حال نہ ہوتی تو ایک طرف مشرکین یکبارگی خندق عبور کر کے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے اور دوسری طرف یہ سارا جنگی سامان عین عقب سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے بنوقریظہ استعمال کرتے۔

غزوۂ بنوقریظہ پر قرآن کا تبصرہ

زیرِ درس رکوع کی بقیہ دو آیات کا تعلق اسی بنوقریظہ کے واقعہ سے ہے' اس لئے میں نے قدرے تفصیل سے صورتِ حال واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو ان آیات کے پس منظر سے براہِ راست متعلق ہے۔ اب ان آیات کا مطالعہ کیجئے۔ فرمایا:

﴿وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا ۝﴾

''اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا (یعنی بنوقریظہ) تو اللہ ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اُس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے کو قید کر رہے ہو۔''

بنوقریظہ پہلے تو محاصرے کی حالت میں اپنے قلعوں پر چڑھے رہے لیکن دو تین ہفتوں سے زیادہ سہار نہ سکے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار لایا۔ یہاں ظَاهَرُوْهُمْ کا لفظ قابل توجہ ہے۔ اس کی اصل ظھر ہے۔ باب مفاعلہ میں اس سے مظاهرة بنتا ہے۔ ظھر پیٹھ کو کہتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں آخری مقابلہ پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر ہوتا تھا۔ اگر کوئی چھوٹی سی نفری کسی بڑی نفری کے گھیرے میں آ جاتی تھی تو چھوٹی نفری والے باہم پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر لڑا کرتے تھے۔ اس طرح اس کا مفہوم ہوگا کسی مقصد کے غلبہ کے لئے یک جان ہو کر کام کرنا۔ اس لئے میں نے اس آیت کی ترجمانی میں ''حملہ آوروں کا ساتھ دینا'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ''صیص'' کی لغوی بحث کو بھی سمجھ لیجئے۔ صیص مرغ کے پنجے کو کہتے ہیں' اس کی جمع ''صیاصی'' ہے۔ چونکہ مرغ اپنے پنجوں سے دفاع کرتا ہے' لہٰذا عرب اس لفظ کو استعارتاً دفاعی قلعوں اور گڑھیوں کے لئے استعمال کرنے لگے۔ بنوقریظہ نہ تو حملہ آوروں کا ساتھ دے سکے اور نہ ان کے قلعے ان کو پناہ دے سکے اور وہ ان سے نیچے اترنے اور باہر نکل کر خود کو نبی اکرم ﷺ کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آپ غور کیجئے کہ اگر وہ دوبدو لڑنے کا فیصلہ کرتے تو ان کے جو چھ سات سو مرد قتل ہوئے تھے یہ سو دو سو مسلمانوں کو بھی شہید کر سکتے تھے۔ انہوں نے جو ساز و سامان جمع کر رکھا تھا' اس کی تفصیل میں بیان کر چکا ہوں' لیکن اسلحہ استعمال کرنے کے لئے ہمت اور جوش و ولولہ درکار ہوتا ہے۔ جب کسی قوم کو ''وھــــن'' کی بیماری لگ جاتی ہے' یعنی حُبِّ دُنیا اور موت کا خوف' تو یہ حال بھی ہوتا ہے کہ میزائل تک دھرے رہ جاتے ہیں اور فوج کو ان کے بٹن دبانے کی جرأت نہیں ہوتی اور وہ جان بچانے کے لئے اپنی جوتیاں چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ یہ معاملہ کئی مواقع پر مسلمانوں کے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ صحرائے سینا سے مصری فوج اسرائیل کے حملے کے وقت بھاگ گئی تھی۔ اسی طرح فتنہ تاتار کے دور میں جب ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تو تاریخ بتاتی ہے کہ بغداد کے بازاروں میں سو مسلمان کھڑے ہوتے تھے اور ایک تاتاری آ کر ان سے کہتا تھا کہ میرے پاس اس وقت تلوار نہیں ہے' میں یہ لے کر آتا ہوں' خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اور وہ تلوار لے کر آتا تھا اور ایک ایک کی گردن مارتا تھا اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ بنوقریظہ میں جرأت و ہمت ہوتی تو حضرت سعدؓ کے فیصلے کے بعد بھی یہ کر سکتے تھے کہ یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑیں کہ ہمیں تو مرنا ہی ہے' سو پچاس کو ساتھ لے کر مریں گے' لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے۔ ان کے مرد قتل کئے گئے اور ان کی عورتیں' بچے اور بچیاں غلام اور لونڈیاں بنائی گئیں۔

اس پوری صورت حال پر صرف ایک آیت میں تبصرہ فرما دیا گیا:

﴿وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۞﴾

''اور اللہ نے تمہیں ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دے دیا جسے تم نے پامال نہیں کیا تھا' اور اللہ ہر چیز پر

قادر ہے۔''

بنوقریظہ ایک بڑا یہودی قبیلہ تھا' بہت مالدار اور سرمایہ دار۔ ان کے بڑے بڑے باغات اور بڑی بڑی حویلیاں تھیں' بے شمار مال و متاع تھا۔ یہ پورا علاقہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بغیر لڑے بھڑے عطا کر دیا۔ جنگ تو ہوئی ہی نہیں۔ صرف محاصرے کے نتیجے میں یہ سب کچھ ہاتھ آ گیا۔ اس زمین پر گھوڑے دوڑے ہی نہیں کہ وہ پامال ہوتی۔

اس رکوع کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۞﴾ اور واقعہ یہ ہے کہ اس مضمون کا اس سے جامع اختتام ممکن ہی نہیں تھا۔ غزوۂ احزاب کی پوری صورتِ واقعہ اور بنوقریظہ کا خاتمہ' یہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کی شان کے مظاہر ہی تو تھے۔ سورۃ یوسف میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞﴾ ''اللہ غالب ہے' وہ اپنا کام کر کے رہتا ہے' لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔'' اگر لوگوں کو یہ یقین قلبی ہو جائے تو اسی سے مانگیں' اسی سے جڑیں' اسی کے دامن سے وابستہ ہو جائیں۔ انہیں تو ان وسائل اور اسباب پر یقین و توکل ہوتا ہے جو ان کی دسترس میں ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَّا تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدَيِ اللّٰهِ))(سنن الترمذی' کتاب الزھد)

''دنیا میں زہد اس چیز کا نام نہیں ہے کہ تم حلال کو اپنے اوپر حرام کر لو اور مال کو ضائع کرو' بلکہ دراصل زہد یہ ہے کہ اللہ پر تمہارا اعتماد و توکل اس سے زیادہ ہو جو تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے''۔

اگر تم اپنے وسائل' اپنے ذرائع' اپنی صلاحیتوں' اپنی ذہانت اور اپنی قوت کو مقدم رکھو گے اور ان پر تکیہ کرو گے تو تم کو زہد چھو کر بھی نہیں گیا۔ لیکن اگر تم کو اللہ کی توفیق' اللہ کی تائید' اللہ کی نصرت اور اللہ کی قدرت پر ہی اعتماد و توکل اور بھروسہ ہو جائے تو یہ اصل زہد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ ہم نے آج اس رکوع کا مطالعہ ختم کر لیا۔ جیسا

کہ میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا تھا کہ ہم اس رکوع کے مطالعہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی سیرت مطہرہ کی روشنی میں آپؐ کے اُس ''اُسوۂ حسنہ'' کو مجموعی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے جو غزوۂ احزاب کے پس منظر میں اس رکوع میں بیان ہوا ہے۔ پورے قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے ''اسوۂ حسنہ'' کا تذکرہ اسی ایک مقام پر کیا گیا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر تو نبی اکرم ﷺ پر خود آپؐ کے ارشاد کے مطابق سب سے سخت دن ''یوم طائف'' گزرا ہے' لیکن بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت پر سب سے زیادہ ابتلاء وآزمائش کا مرحلہ یہ غزوۂ احزاب ہے' جس میں جانی نقصان تو اگرچہ بہت کم ہوا لیکن اس محاصرے کے دوران' جو تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کو جن شدائد ومصائب اور تکالیف سے سابقہ پیش آیا ان کو بجا طور پر ابتلاء کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ دی ہے: ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝﴾

آج کا یہ درس ان لوگوں کے لئے انتہائی سبق آموز ہے جو بفضلہ تعالیٰ شعوری طور پر یہ بات جان چکے ہیں کہ اعلائے کلمۃ اللہ' اظہار دین الحق اور اقامت دین' نبی اکرم ﷺ کے ہر امتی پر فرض ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی تقریر میں حضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کے مختلف پہلو اجاگر کروں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

اُسوۂ رسول ﷺ
کی روشنی میں
ہماری دینی ذمہ داریاں

احمدہ واُصلی علی رسولہ الکریم ــــ اما بعد

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم   بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾ (الاحزاب: ۲۱) صدق اللّٰہ العظیم

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی!

سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کے درس کی تکمیل کے بعد میں چاہتا ہوں کہ اس نشست میں آپ نبی اکرم ﷺ کے ''اسوۂ حسنہ'' کے بارے میں چند اور باتیں سلسلہ وار ایک' دو' تین کی طرح نوٹ کرلیں اور اپنے ذہن میں بٹھا لیں۔

نبی اکرم ﷺ کی اجتماعی جدوجہد کی نوعیت

میں دورانِ درس یہ عرض کر چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اور حیات طیبہ ہر ایک اعتبار سے اسوہ ہے۔ ''اسوہ'' کا اصل مفہوم اتباع اور پیروی ہے۔ لیکن سورۃ الاحزاب کے درس کے دوران آنحضور ﷺ کا جو اُسوہ ہمارے سامنے آتا ہے' اس کو پیش نظر رکھئے اور پہلے ایک سوال کا جواب آپ خود اپنے طور پر دینے کی کوشش کیجئے کہ آنحضور ﷺ کی جو اجتماعی جدوجہد ہے' وہ کیا ہے؟

آنحضور ﷺ کے بعض کام خالص انفرادی ہیں اور وہ ایسے بھی ہیں کہ ہم ان کا اتباع نہیں کر سکتے۔ مثلاً نبی اکرم ﷺ صومِ وصال رکھتے تھے۔ یعنی آپؐ بغیر افطار

کے ایک کے بعد دوسرا' پھر تیسرا روزہ بلکہ اس سے بھی زیادہ رکھا کرتے تھے' لیکن آپ ؐ
نے امت کو اس سے روک دیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا بھی کہ
آپ ؐ ہمیں کیوں منع فرماتے ہیں؟۔ جواب میں ارشاد ہوا: ((وَاَیُّکُمْ مِثْلِیْ؟)) ''تم
میں سے کون ہے جو مجھ جیسا ہو؟'' ((اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ)) (متفق
علیہ) ''میں تو اس حال میں رات بسر کرتا ہوں کہ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے''۔
معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ کی انفرادی زندگی کے بعض پہلو ایسے ہو سکتے ہیں جن کے
لئے ہم اتباع کے مکلف نہیں ہیں___ وہ خصوصیات ہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی۔
حضور ؐ فرماتے ہیں کہ میں اپنی پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے
لئے یہ ناممکن ہے۔ اس اعتبار سے اوّلیت جس اسوہ کو حاصل ہے' وہ اُسوہ آپ کی
اجتماعی زندگی کا نقشہ ہے۔ اس کا ہر ہر قدم واجب الاتباع ہے۔ اسی اعتبار سے یہ فرمایا
گیا ہے کہ: ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ﴾۔ اس لئے میں یہ
کہہ رہا ہوں کہ آپ ذرا اپنے ذہن میں یہ سوال لائیے کہ نبی اکرم ﷺ کی جو اجتماعی
جدوجہد ہے' وہ کس نوعیت کے کام سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے! مثلاً ایک نوعیت ہوتی
ہے رفاہِ عامہ کے کاموں کی___ لوگ یہ کام کرتے ہیں۔ پھر خدمتِ خلق کے بے شمار
میدان ہیں' جن کے لئے انجمنیں بنتی ہیں' ادارے وجود میں آتے ہیں۔

دوسرے کچھ محدود پیمانے کے تبلیغی کام ہوتے ہیں۔ دنیا میں بے شمار مشنریز
(Missionaries) ہیں جو تبلیغ کے کام میں مصروف ہیں۔ یہودیوں کی تبلیغ ہے'
عیسائیوں کی تبلیغ ہے۔ بدھ مت کے بھکشو ہیں جو تبلیغ کرتے ہیں۔ آریہ سماجی بھی یہ کام
کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک اجتماعی نوعیت کا کام ہے۔ یہ وہ تبلیغ ہے جس میں تلوار کبھی ہاتھ
میں نظر نہیں آئے گی۔ اس تبلیغ کا معاملہ کبھی جہاد و قتال تک نہیں جائے گا۔ وہ ساری عمر
تبلیغ ہی رہے گی اور نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

ذہن میں تیسرا خانہ بنائیے تعلیمی اور تحقیقی کام کا۔ اس کے لئے بھی انجمنیں بنتی ہیں'
ادارے بنتے ہیں___ تعلیم کو عام کرنے کی عملی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ مکتب' اسکول'

کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوتی ہیں۔ ریسرچ کے لئے ادارے اور فاؤنڈیشنز قائم
ہوتی ہیں جن کے تحت یہ کام ہوتا ہے۔ کسی خاص فکر کو پھیلانے اور promote
کرنے کے لئے اکیڈمیاں بنتی ہیں' جیسے ''اقبال اکیڈمی'' جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کے فکر کو
پھیلانے کے کام میں مصروف ہے۔ سقراط نے بھی ایک اکیڈمی بنائی تھی' جس میں وہ
اپنے فکر کے مطابق کچھ ذہین لوگوں کو تیار کرتا تھا۔

چوتھا کام سیاسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی جماعتیں' جمعیتیں اور
پارٹیاں بنتی ہیں' تحریکیں اٹھتی ہیں' سیاسی میدان میں کام ہوتا ہے' الیکشن ہوتے ہیں۔
اس سیاسی کام کی اصل نوعیت عموماً یہ ہوتی ہے کہ جس جگہ جو نظام قائم ہوتا ہے اصولی
اعتبار سے اُس سے اختلاف نہیں ہوتا۔ صرف تفصیلات میں اور انتظامی اعتبارات سے
ایک جماعت کا منشور (Manifesto) کچھ اور ہوتا ہے اور دوسری جماعت کا کچھ
اور۔ مثلاً امریکہ میں ڈیموکریٹس اور ری پبلکن پارٹیاں ہیں' انگلینڈ میں لیبر پارٹی'
کنزرویٹو پارٹی اور لبرل پارٹی ہے' تو امریکہ یا انگلستان میں جو بنیادی دستور موجود
ہے اور جو نظام رائج ہے یعنی جمہوریت کا نظام' وہ سب پارٹیوں کے نزدیک متفق علیہ
ہوتا ہے۔ لیکن تفصیلات میں جا کر چند پالیسیوں کے بارے میں اختلافات ہوتے ہیں
اور اس ضمن میں پارٹیوں کے منشور اختلافات کے حامل ہوتے ہیں۔ ہر پارٹی اس
اعلان کے ساتھ الیکشن کے میدان میں اترتی ہے کہ اگر ہمیں زیادہ ووٹ ملیں گے اور
اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا تو ہم یہ اور یہ کام کریں گے جس سے ملک اور عوام کو
فائدہ پہنچے گا۔ یہ ہوتی ہے سیاسی کام کی حقیقی نوعیت۔

اسی طرح کئی دیگر نوعیتوں کے کام بھی ہو سکتے ہیں' لیکن آپ ان چار انواع کے
کاموں کو ذہن میں رکھ کر اب پانچویں نوعیت کے کام پر غور کیجئے' اور وہ ہے انقلابی کام۔
انقلاب یہ ہوتا ہے کہ کسی جگہ پر جو نظام قائم ہے اس کو جڑ سے اکھیڑنا ہے' بنیادی تبدیلی
لانی ہے اور پورے نقشے کو بدلنا ہے۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآ باداں کنند

تو می دانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند!

یہ انقلابی کام اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ رائج الوقت نظام کو جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ کر اس کی جگہ دوسرا نظام نہ لایا جائے۔

اب ان پانچ انواع کے کاموں کو ذہن میں بٹھا لیجئے: ۱۔رفاہی کام' ۲۔تبلیغی کام' ۳۔تعلیمی' علمی اور تحقیقی کام' ۴۔سیاسی کام' اور ۵۔انقلابی کام۔ ان میں سے ہر ایک کے اپنے تقاضے اور اپنی connotations ہیں۔ چنانچہ ہر ایک کا نقشہ جدا بنے گا' ہر ایک کے لوازم جدا ہوں گے۔

اب آپ میرے اس سوال کا جواب دیجئے کہ نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ان پانچ کاموں میں سے کس کام سے مشابہت رکھتا ہے؟

کیا اس میں کوئی شک ہے کہ وہ انقلابی کام ہے؟ یعنی نظام کی تبدیلی اور وہ بھی جزوی نہیں' بلکہ پورے نظام کی تبدیلی۔ وہ صرف تبلیغی کام نہیں تھا' صرف علمی کام نہیں تھا' صرف سیاسی کام نہیں تھا' صرف رفاہی کام نہیں تھا۔ بلکہ اجتماعی پیمانے پر رفاہی کام تو ہمیں نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے درمیان نظر ہی نہیں آتے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں اجرائے وحی سے قبل بالکل انفرادی سطح پر خدمتِ خلق اور رفاہِ عامہ کا کام اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے' لیکن نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد حضور ﷺ کی پوری زندگی ایک انقلابی جدوجہد کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ جزوی نہیں' بلکہ مکمل انقلابی جدوجہد۔ گویا ع

نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!

سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر اپنی متعدد تقاریر میں مَیں اس انقلابی جدوجہد کے نقشے کو اپنی امکانی حد تک بڑی تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اس موقع پر میں چاہوں گا کہ اختصار کے ساتھ اس جدوجہد کے اہم خصائص اور اصول ومبادی آپ کے سامنے اس طرح پیش کروں کہ آپ ان کو ترتیب وار ذہن نشین کر لیں۔

آنحضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے مراحل

اس انقلابی جدوجہد کے ضمن میں آپ کو سیرتِ مطہرہ میں سب سے اوّل اور نمایاں چیز یہ نظر آئے گی کہ یہ ساری جدوجہد خالص انسانی سطح (Human Level) پر کی گئی ہے۔ کسی بھی انقلاب میں جو مراحل آتے ہیں' وہ سب کے سب انقلابِ محمدیؐ میں بھی آئے — ہر انقلابی دعوت کو تین مراحل سے لازماً سابقہ پیش آتا ہے:

پہلا مرحلہ ہے ''دعوت وتربیت''۔ خالص دینی اصطلاحات کے اعتبار سے یہ بات اس طرح کہی جائے گی کہ ''دعوتِ ایمان اور تزکیہ''۔ یعنی لوگوں کو اللہ کی آیات سنانا اور قبول کرنے والوں کا تزکیہ کرنا۔ از روئے الفاظ قرآنی ﴿يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۵۱) عام دُنیوی لحاظ سے اس کی تشریح یوں ہوگی کہ کوئی انقلابی فکر' کوئی نظریہ' کوئی فلسفہ اور کوئی نقطۂ نظر ہوگا' اس کو پہلے پھیلایا جائے گا۔ جو اس دعوت کو قبول کریں گے تو اس دعوت کے اعتبار سے پھر ان کی تربیت کی جائے گی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم۔

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو!

پختہ ہوئے بغیر کام نہیں چلے گا۔ البتہ واضح رہے کہ انقلابی کارکنوں کی تربیت دعوت کے لحاظ سے ہوگی— مثلاً جو لوگ کمیونزم کے نظریئے کو قبول کر لیں گے' ان کی تربیت کے لئے کوئی اور نظام ہوگا—اس میں یہ نہیں ہوگا کہ نماز پڑھو' روزہ رکھو' زکوٰۃ ادا کرو' حج کرو اور اپنے تمام معاملات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات واحکام کے تابع رکھو۔ نہ اس میں یہ ہوگا کہ اپنی نظر اور دل کو پاک صاف رکھو۔ کھلی آزادی ہوگی کہ جس طرح چاہو اپنی تسکینِ ہوس کا سامان کر لو۔ جاؤ عیش کرو' شادی کا کیا سوال ہے' اس کے بغیر بھی جنسی ضرورت کو کامریڈ مَرد اور کامریڈ عورتیں مل جل کر پوری کریں۔ ان کی تربیت میں طبقاتی نفرت وعداوت پیدا کی جائے گی۔ مزدور اور سرمایہ دار کا امتیاز

اجاگر کر کے ان کو آپس میں لڑانے کی سبیل پیدا کی جائے گی۔ ان کو تخریب کاری کی ٹریننگ دی جائے گی۔ تربیت کا نظام ہر انقلابی دعوت میں ہوتا ہے لیکن اس کا حدود اربعہ مختلف ہوتا ہے' اس کے صغریٰ کبریٰ اور متعلقات جدا ہوتے ہیں۔ وہ اس نقطۂ نظر کے مطابق ہوں گے کہ اصل کام کیا کرنا ہے اور کونسا انقلاب لانا پیش نظر ہے۔ سوشلسٹ انقلاب برپا کرنا ہے تو اس کی تربیت کی نوعیت وہ گی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اسلامی انقلاب لانا ہے تو اس کی تربیت کی نوعیت دوسرے انقلابات کی تربیت کے معاملے میں بالکل جداگانہ نوعیت کی ہوگی۔ اس میں اللہ پر' توحید کے التزام اور شرک سے اجتناب کے ساتھ' ایمان لانا ہوگا۔ اس میں یوم آخرت پر' اس کی کل جزئیات کے ساتھ' ایمان لانا ہوگا۔ اس میں رسالت پر' اطاعت ومحبت کلی کے ساتھ' ایمان لانا ہوگا— بہرحال ''دعوت اور تربیت'' ان دونوں الفاظ کو ایک جوڑے کی حیثیت سے بریکٹ کر لیجئے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی یہ دونوں کام کئے اور بھرپور طریقے پر کئے۔

دوسرا مرحلہ ہے ''تنظیم''۔ اور اسی کے ساتھ جڑا ہوا لفظ ہے ''ہجرت''۔ یعنی آپس میں جڑو اور دوسروں سے کٹو۔ اگر کسی سے کٹو گے تو کسی سے جڑو گے بھی۔ جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے جڑو گے تو ظاہر ہے کہ اپنے گھر والوں سے کٹو گے۔ سیدھی سادھی بات ہے' اس میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ یہاں یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ دونوں رشتے ساتھ چل سکیں۔ یہاں credit ہوگا تو debit بھی ہوگا۔ اگر کسی سے کٹنے کو تیار نہیں تو پھر کسی اور سے جڑ بھی نہیں سکتے۔ چنانچہ آپ ان دو الفاظ تنظیم اور ہجرت کو اپنے ذہن میں یکجا کر لیجئے۔

تیسرا مرحلہ ہے جہاد اور قتال—— جہاد کو میں یہاں Passive Resistance کے معنی میں لے رہا ہوں۔ جدوجہد ہے' دعوت وتبلیغ ہے' مشرکانہ عقائد پر تنقید ہے۔ اس کے ردّعمل میں مشرکین کی طرف سے جور وستم ہے' ایذا رسانی ہے' تعدّی ہے' مصائب ہیں— لیکن ابھی ہاتھ نہیں اٹھ رہا۔ حکم ہے کہ ماریں کھاؤ مگر مدافعت میں بھی اپنا ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے تو بھی برداشت کرو اور جھیلو۔ تمہیں تپتی ہوئی زمین پر اس حال میں لٹا دیا جائے کہ اوپر سے مکہ

جیسے گرم علاقے کا سورج آگ برسا رہا ہو' پھر تمہارے سینے پر پتھر کی سل رکھ دی جائے' تمہاری ٹانگوں میں رسی باندھ کر کھینچا جائے' تو بھی جھیلو اور برداشت کرو' retaliate نہیں کر سکتے۔ میں کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ ایسے حالات میں اگر آدمی desperate ہو جائے' اپنی جان سے ناامید ہو کر مشتعل ہو جائے تو ایک آدمی دس کو مار کر مرے گا۔ لیکن نہیں!— کیا حضرت یاسر ؓ کسی کو نہ مار سکتے تھے جب ان کی نگاہوں کے سامنے ان کی اہلیہ محترمہ سمیہ (رضی اللہ عنہا) کو ابوجہل نے اس طرح برچھی ماری کہ پشت کے پار ہوگئی! پھر وہ خود یعنی حضرت یاسر ؓ کس طرح مظلومانہ اور بہیمانہ طور پر شہید ہوگئے' لیکن اُف تک نہ کی۔ اس لئے کہ ایمان لانے کی وجہ سے اس خاندان پر ظلم وستم کے پہاڑ بہت پہلے سے توڑے جا رہے تھے اور جب کسی ایسے موقع پر نبی اکرم ﷺ کا گزر ہوتا تو آپؐ فرماتے: اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرَ فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ ''اے یاسرؓ کے گھر والو! صبر کرو' تمہارا ٹھکانا جنت ہے۔'' گویا انہیں شہادت اور جنت کی خوش خبری پیشگی دے دی گئی تھی— حضرت خباب بن ارت ؓ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ اوپر نگرانی کے لئے آدمی کھڑا ہوا ہے۔ حکم ہے جھیلو! پیٹھ کی چربی پگھلتی ہے اور آگ سرد پڑ جاتی ہے۔

پھر خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اَقدسؐ پر کیا کچھ ستم روا نہیں رکھا گیا۔ آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں جس سے آپ کے پاؤں مبارک زخمی ہو جاتے ہیں۔ یہ کام رات کے اندھیرے میں کیا جاتا ہے' کیونکہ آپؐ علی الصبح تاروں کی چھاؤں میں نماز کے لئے باہر نکلا کرتے تھے۔ آپؐ کے مکان میں گندگی پھینکنے کو معمول بنا لیا جاتا ہے۔ اور یہ دونوں کام کرنے والے کون ہوتے ہیں!— آپؐ کے پڑوسی اور رشتے میں آپؐ کے سگے چچا اور چچی یعنی ابولہب اور اُس کی بیوی اُمّ جمیل۔ چادر گردن میں ڈال کر اسے اس طرح بل دیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھیں اُبل پڑتی ہیں— سجدے کی حالت میں رحمۃ للعالمین ﷺ کے مقدس کاندھوں پر اونٹ کی نجاست بھری اوجھری رکھ دی جاتی ہے۔ تمسخر' استہزاء' طعن وتشنیع اور فقرے چست کرنا روز کا معمول بن جاتا ہے۔ قلب

مبارک پر جو بیتتی ہوگی، وہ بیتتی ہوگی، مؤمنین صادقین کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی کہ ان کے پیارے اور محبوب رسول اللہ ﷺ پر کتنے مصائب ڈھائے اور ستم توڑے جا رہے ہیں! مگر وہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ کو حکم تھا کہ جھیلو، برداشت کرو، صبر کرو۔ اور آپ ﷺ کی وساطت سے یہی حکم تمام اہل ایمان کے لئے تھا۔

اس سے اگلا مرحلہ قتال کا ہے۔ جب دعوت منظّم ہو جاتی ہے اور یثرب کو دارالہجرۃ بننے کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ مدینۃ النبیؐ بن جاتا ہے اور مسلمان بالفعل ہجرت یعنی ترکِ وطن کر کے وہاں جمع ہو جاتے ہیں تو ایک Base مہیا ہو جاتی ہے اور ایک چھوٹی سی شہری اسلامی ریاست قائم ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر قتال کا مرحلہ آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج میں بایں الفاظ قتال کی اجازت مل جاتی ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴾

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔''

سورۃ النساء میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جب ان سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ تو کہتے تھے کہ ہمیں بھی جنگ کی اجازت ہونی چاہئے، ہم بھی لڑیں، ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ اب جبکہ لڑائی کا حکم آ گیا ہے تو لڑائی بڑی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ تو وہاں یہ الفاظ آئے ہیں کہ:

﴿ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ ﴾ (آیت ۷۷)

''اب جو انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں ایک فریق ایسا بھی ہے کہ (جس کا دل ڈول رہا ہے اور) وہ انسانوں سے اس طرح ڈر رہا ہے کہ جیسے اللہ سے ڈرنا چاہئے، بلکہ کچھ اس سے بھی بڑھ کر''۔

کسی انقلابی دعوت کے مذکورہ بالا تین مراحل ہوتے ہیں۔ مرحلے تین ہیں لیکن الفاظ چھ ہیں۔ گویا ہر مرحلے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ ہے دعوت و تربیت۔

دوسرا مرحلہ ہے تنظیم و ہجرت اور تیسرا اور آخری مرحلہ ہے جہاد و قتال۔ ان مراحل سے گزرے بغیر دنیا میں کبھی کوئی انقلاب نہیں آیا ہے۔ عیسائی طرز کی تبلیغ ہو سکتی ہے۔ تبلیغ کا کام آپ بھی کیجئے، کرتے چلے جایئے۔ اس سے اگلا مرحلہ نہیں آئے گا۔ وہی کام نسلاً بعد نسلٍ ہوتا رہے گا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کا کام اگر آپ دیکھیں گے تو وہ نہ رفاہی کام ہے، نہ تبلیغی کام، نہ تعلیمی و علمی کام۔ یہ سارے کام اس انقلابی کام میں جزو کی حیثیت سے تو شامل ہیں، لیکن کل کام خالصتاً انقلابی کام کے مشابہ ہے۔ پھر یہ انقلابی جدوجہد مکمل اور بھرپور انقلابی جدوجہد ہے۔ نیز یہ پوری انقلابی جدوجہد انسانی سطح (Human Level) پر ہوئی ہے۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار!

تین سال کی قیدِ شعب بنی ہاشم ہے۔ جس میں ایسا وقت بھی آیا ہے کہ کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ گھاٹی کی جھاڑیوں کے پتے سب کے سب کھا لئے گئے تھے اور بھوک اور پیاس کے مارے بنی ہاشم کے بچوں کی زبانیں خشک ہو گئی تھیں، جن کو تر رکھنے کے لئے سوکھے چمڑے ابال ابال کر ان کے حلق میں بوندیں ٹپکائی جاتی تھیں۔ بنی ہاشم کا پورا قبیلہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہی اس گھاٹی میں قید کر دیا گیا تھا ــــ اور ع ''رسوا سرِ بازارے آں شوخ ستمگارے'' کا نقشہ دیکھنا ہو تو وہ یوم طائف دیکھ لیجئے کہ جہاں ایک دن میں وہ کچھ بیت گیا جو مکہ میں دس سال میں نہیں بیتا تھا۔ طائف کے سرداروں نے دعوتِ حق اور دعوتِ توحید کو حقارت اور استہزاء کے انداز میں ٹھکرا دیا اور آپ ﷺ سے جو کچھ انہوں نے کہا اس کو سننے کے لئے بھی بڑے جگرے کی ضرورت ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ ایک سردار نے کہا کہ ''اللہ کو تم جیسے مفلس و قلاش کے سوا رسول بنانے کے لئے کوئی اور نہیں ملا؟ اس طرح تو وہ گویا خود کعبے کے غلاف کو چاک کر رہا ہے''۔ ایک سردار نے کہا کہ ''میں تم سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں، اس لئے کہ اگر تم سچے ہو اور واقعتاً رسول ہو تو ہو سکتا ہے کہ میں کہیں توہین کا مرتکب ہو جاؤں اور عذابِ الٰہی کا نوالہ بن جاؤں، اور اگر تم جھوٹے ہو تو کسی جھوٹے سے کلام کرنا میری

شان کے خلاف ہے۔'' ایسے ہی اور جملے ان سرداروں میں سے ہر ایک نے کہے۔ پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب نبی اکرم ﷺ بظاہر احوال مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو کچھ غنڈوں کو اشارہ کر دیا۔ اوباش لوگ آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر وہ نقشہ جما ہے کہ جس پر آسمان و زمین لرز گئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ ان اوباشوں نے محبوبِ ربّ العالمین سیّد الاولین والآخرین ﷺ پر پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے' تالیاں پیٹی جا رہی ہیں۔ حضور ﷺ کا جسدِ اطہر لہولہان ہو گیا ہے۔ نعلین شریف خون سے بھر گئی ہیں اور پیر جم گئے ہیں۔ ایک موقع پر آپ ﷺ ضعف کے مارے ذرا بیٹھ گئے ہیں تو دو غنڈے آگے بڑھتے ہیں اور بغلوں میں ہاتھ ڈال کر آپ کو کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو۔ رسول اللہ ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلاء اور امتحان کا یہ نقطۂ عروج (Climax) ہے۔ شہر سے باہر آ کر آپ ﷺ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر تشریف رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ دعا آپ کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہے کہ جس کو پڑھتے' سنتے اور سناتے وقت کلیجہ شق ہوتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْا ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

''اے اللہ! کہاں جاؤں' کہاں فریاد کروں' تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں' اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی ___ اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے' اس کی''۔

اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ؟

''اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟''

اِنْ لَمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ!

''پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں' مجھے اس تشدد کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' (ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!)

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ

''اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات بھی منور ہو جاتے ہیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یومِ اُحد کے بعد نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ ''یا رسول اللہ! کیا اس سے زیادہ سخت دن بھی آپؐ کی زندگی میں آیا ہے؟'' تو آپؐ نے جواب میں فرمایا تھا: ''ہاں! یومِ طائف میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت دن تھا''۔ یہ تمام مصائب و مشکلات کے ادوار نبی اکرم ﷺ پر بھی آئے اور صحابہ کرام ؓ پر بھی۔ اس میں ایک نکتے کی بات ہے' اس پر غور کیجئے۔ وہ یہ کہ ہمارا صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ سیّدِ وُلدِ آدم اور محبوبِ ربّ العالمین ہیں۔ دوسری طرف آپ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کو اپنی انقلابی جدوجہد میں بدترین مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دونوں کو جوڑیئے۔ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھا کہ انقلاب بھی آ جاتا اور محمد ﷺ کے پاؤں میں کانٹا بھی نہ چبھتا؟ یہ ہو سکتا تھا' لیکن ہوا نہیں! سوچئے کیوں نہیں ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو مجھ پر اور آپ پر حجت قائم نہ ہوتی۔ انقلاب صرف عرب میں لانا مقصود نہیں تھا' اسے پوری دنیا میں لانا تھا اور وہ انسانوں کے ہاتھوں آنا تھا۔ معجزے تو رسولوں کے لئے ہیں' عام انسانوں کے لئے تو نہیں ہیں۔ آگے جو کام کرنا تھا' اس کے لئے اُسوہ کیسے بنتا اگر محمد رسول اللہ ﷺ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ہوتی؟۔

اس لفظ اُسوہ کو یہاں سمجھئے۔ اللہ کر سکتا تھا' لیکن اس نے نہیں کیا۔ اس کا حکم تو یہی تھا کہ ''اے محمدؐ! جھیلو' برداشت کرو''۔ اللہ کی شان بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس لئے صرف بطورِ تفہیم بہت ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں کہ اگر ہم اپنے احساسات پر قیاس کریں تو کیا بیتی ہو گی اللہ پر! جب طائف میں اس کا محبوب پتھروں کی زد میں تھا۔ جب تالیاں پٹ رہی تھیں ___ لیکن اُس کا فیصلہ یہی تھا کہ اے محمدؐ! صبر کرو' جھیلو' برداشت کرو۔ وہی بات جو آنجناب ﷺ اپنے صحابہ ؓ سے کہہ رہے ہیں۔ جیسا کہ آلِ یاسر پر ظلم و ستم کے واقعے کے دوران ذکر ہوا۔ اسی طرح مکی دور میں مصائب و شدائد' ایذا

رسانی‘ جور وتعدی اور طنز واستہزاء کے مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ کو بھی وحی الٰہی کے ذریعے یہ ہدایات مل رہی ہیں کہ: ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾۔ ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا﴾ ﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾۔ مختلف اسالیب سے صبر کی ہدایت اور تلقین ہو رہی ہے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ ”جیسے ہمارے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے ویسے آپ بھی صبر کیجئے۔“ ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ ”صبر کیجئے اور آپ کا سہارا بس اللہ ہی ہے“۔ یعنی صبر کے لئے بھی کوئی سہارا چاہئے تو آپ کا سہارا ہم خود ہیں۔ ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾۔ ”پس صبر کیجئے اور اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے اور کہیں مچھلی والے کی طرح جلدی نہ کر لیجئے گا“۔ ﴿وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ ”اور صبر کیجئے‘ اللہ محسنین یعنی خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا“۔

یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس کو جانئے اور سمجھئے۔ یہ اس لئے ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس ﷺ کو ہمارے لئے اسوہ بننا تھا۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہمارے لئے اُسوہ کیسے بنتی!— یہ مجھ پر حجت ہے‘ آپ پر حجت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ کیا‘ وہ خالص انسانی سطح (Human Level) پر کیا ہے‘ سارے دکھ اٹھا کر کیا ہے‘ فاقے جھیل کر کیا ہے‘ پتھراؤ برداشت کر کے کیا ہے‘ قید و بند کی تکالیف اٹھا کر کیا ہے‘ اپنے دندانِ مبارک شہید کروا کر کیا ہے‘ اپنے عزیزوں اور جاں نثاروں کے لاشے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کیا ہے‘ پیٹ پر ایک نہیں دو دو پتھر باندھ کر کیا ہے— یہ سارے مصائب جھیلے ہیں‘ تب انقلاب برپا ہوا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا سب سے زیادہ نمایاں اُسوہ کیا ہوا؟ یہ ساری گفتگو ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ کے تحت ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے پہلا اُسوہ تو یہ ہوا کہ بحیثیت مجموعی نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد خالصتاً انقلابی جدوجہد کے مشابہ ہے۔ جبکہ دوسرا اُسوہ یہ ہے کہ یہ ساری جدوجہد انسانی سطح (Human Level) پر قدم بقدم مصائب و تکالیف‘ جور وتعدی اور ظلم وستم جھیل کر ہوئی ہے۔

نصرتِ الٰہی کا ظہور

اس موقع پر مبادا کوئی اشکال پیدا ہو جائے یا مغالطہ لاحق ہو جائے‘ لہٰذا عرض کر دوں کہ اس میں شک نہیں کہ اس جدوجہد میں اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید بھی آئی ہے۔ اور اس نصرت وتائید کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

لیکن یہ نصرت وتائید کب آئی ہے؟ یہ اُس وقت آئی ہے جب مؤمنین صادقین جو کچھ کر سکتے تھے وہ سب کر گزرے۔ اس سے پہلے نصرتِ الٰہی نہیں آیا کرتی۔ اس نصرت کی لازمی شرط یہ ہے کہ: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝﴾ (سورۃ محمد: ۷) ”اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔“ غزوۂ بدر کے موقع پر جنگ سے ایک رات قبل نبی اکرم ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ ”اے اللہ! میں نے پندرہ برس کی کمائی لا کر میدان میں ڈال دی ہے۔ اگر کل یہ شہید ہو گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا‘ اس لئے کہ میں آخری رسول ہوں اور میری پندرہ برس کی کمائی یہ ہے کہ جو دین کی سربلندی کے لئے میں نے میدان میں لا ڈالی ہے۔“ چنانچہ بدر کے معرکہ میں اللہ کی نصرت آئی اور ۳۱۳ بے سروسامان مؤمنین صادقین کے ہاتھوں کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار لشکر کو شکست نصیب ہوئی۔ لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ بچ بچ کر اور تحفظ کا خیال رکھ رکھ کر اور اپنی جیبوں کو سکیٹر سکیٹر کر رکھنے کے ساتھ ہم یہ امید رکھیں کہ اللہ کی تائید ونصرت ہمیں حاصل ہو جائے تو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اپنے حلوے مانڈے میں ہم کوئی کمی کرنے کے لئے آمادہ نہیں‘ کاروبار میں سود شامل ہے تو اس کو چھوڑنے کے لئے ہم تیار نہیں‘ کیونکہ اس طرح تو کاروبار سمٹ اور سکڑ جائے گا۔ دین کے کام کے لئے وقت لگائیں تو پھر ہمارا یہ معیار اور status کیسے برقرار رہے گا! ہم تو بچ بچ کر آرام سے گھروں میں بیٹھے رہیں اور یہ چاہیں کہ اللہ اپنی نصرت وتائید لئے ہمارے پیچھے پیچھے آئے کہ لیجئے میری

نصرت وتائید قبول فرما لیجئے' تو یہ ہونے والی بات نہیں ہے۔ع ایں خیال است ومحال است وجنوں!۔ یہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ محبوبِ ربّ العالمین ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ نہیں ہوا تو ہمارے سر پر کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ یہ معاملہ ہو جائے گا؟ کبھی نہیں ہو سکتا! ہوتا تو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہوتا۔ اس معاملے میں استثناء (Exception) اگر ہوتا تو اس قاعدہ کلیہ سے مستثنٰی آپ ﷺ ہی ہو سکتے تھے۔

نصرت وتائید کے ضمن میں آپ کو یہ بھی بتا تا چلوں کہ یوم طائف کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے جو دعا کی تھی اس کے بارے میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ع اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ فوراً ملک الجبال یعنی وہ فرشتہ جو پہاڑوں کی دیکھ بھال کے لئے مامور ہے حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ ''حضور! اللہ نے مجھے آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ اگر آپ حکم دیں تو میں ان پہاڑوں کو ٹکرا دوں جن کے مابین وادی میں طائف کا شہر واقع ہے تا کہ اس کے رہنے والے پس کر سرمہ بن جائیں''۔ اس پر رحمۃ للعالمین ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''میں لوگوں کے عذاب کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ لوگ مجھ پر ایمان نہیں لائے لیکن کیا عجب کہ ان کی آئندہ نسلوں کو اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق عطا فرمائے!''۔ دیکھ لیجئے کہ جس موقع پر غیبی نصرت بھیجی گئی وہ کون سا موقع تھا؟ یہ وہ موقع تھا کہ جس سے سخت دن خود حضور ﷺ کے بقول آپؐ کی زندگی میں کوئی اور نہیں گزرا۔ اس سے پہلے بھی خفی غیبی امداد ونصرت ہوئی ہے۔ لیکن نصرتِ الٰہی کا اصل ظہور ہوتا ہے یوم طائف کے بعد۔ چنانچہ فوری طور پر تو ملک الجبال کی حاضری ہے۔ لیکن اب ٹھنڈی ہوائیں یثرب کی طرف سے آنے لگیں۔ آپ ﷺ تو مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے' لیکن نصرت وحکمتِ الٰہی نے مدینہ منورہ کی طرف سے کھڑکی کھول دی۔ یوم طائف کے سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی کتاب ''النبی الخاتم ﷺ'' میں بہت ہی عمدہ نکتہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''یوم طائف نبی اکرم ﷺ کی زندگی کا Turning Piont تھا۔ اُس دن تک

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبیؐ کو دشمن کے حوالے کیا ہوا تھا کہ جس طرح چاہو ہمارے رسولؐ کے صبر کا امتحان لے لو' جس طرح چاہو ان کی استقامت کو جانچ پرکھ لو' ہمارے رسولؐ کی سیرت وکردار کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لو۔ اُس دن کے بعد نبی اکرم ﷺ کے لئے خصوصی نصرت اور تائید کا ظہور شروع ہوتا ہے۔''

آنحضور ﷺ کی اجتماعی جدوجہد میں قرآن کا مقام

اب میں سیرتِ مطہرہ اور خاص طور سے اس اسوۂ حسنہ کے ان تین مراحل کے اعتبار سے ایک تجزیہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جن کا میں نے آغاز میں ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اُسوۂ حسنہ کے ضمن میں دو باتیں بحیثیت مجموعی بیان کی ہیں کہ محض آرزو یا مرثیہ پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دین کا دل میں درد ہے تو ہمیں اُسوۂ حسنہ کے مطابق انقلابی جدوجہد کرنا ہوگی۔ ہمیں مرثیہ پڑھنا اور رونا بہت آتا ہے۔ لیکن اگر یہ رونا نبی اکرم ﷺ کے اجتماعی اُسوۂ حسنہ کے ساتھ ہو تو یہ سونا ہے' اس کے مطابق عمل نہیں ہے تو یہ ٹسوے ہیں' جو عورتیں بہایا کرتی ہیں' جن کی دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

اب ذرا ان تین اجزاء کو لیجئے' جن کو میں نے دو دو لفظوں کے جوڑوں کے ساتھ تین مراحل کے عنوانات کے تحت آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔

سب سے پہلی بات یہ کہ ''دعوت وتربیت'' کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا اُسوہ یہ ہے کہ ان دونوں کاموں کا مرکز' مبنیٰ' مدار اور محور قرآن اور صرف قرآن رہا ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا تھا کہ لوگوں کو ایمان کی دعوت دو قرآن کے ذریعے۔ تذکیر کرو قرآن کے ذریعے۔ انذار کرو قرآن کے ذریعے۔ تبشیر کرو قرآن کے ذریعے۔ نصیحت اور موعظت کرو قرآن کے ذریعے۔ بحث ومباحثہ اور جدال ومحاجہ کرو اس قرآن کے ذریعے۔ تبلیغ کرو قرآن کی۔! دعوت کی مختلف سطحوں کے لئے یہی الفاظ آتے ہیں۔

اب ذرا ان الفاظ کے مطابق وہ ہدایاتِ الٰہی سنئے جو قرآن حکیم میں نازل ہوئی

ہیں۔فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۞﴾ (ق:۴۵) پس یاددہانی کراؤ بذریعہ قرآن ہر اُس شخص کو جو میری پکڑ اور سزا سے ڈرتا ہو‘‘۔ ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ (الانعام:۱۹) ’’اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں بھی خبردار کردوں اور اُن کو بھی جن کو یہ (قرآن) پہنچے‘‘ — ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۞﴾ (مریم:۹۷) ’’پس (اے نبیؐ) ہم نے اس کتاب کو آپؐ کی زبان میں اس لئے آسان بنایا ہے کہ آپؐ اس کے ذریعے خداترسوں کو بشارت پہنچا دیں اور جھگڑالو قوم کو اس کے بُرے انجام سے آگاہ اور خبردار کردیں‘‘۔اس آیت میں خاص بات نوٹ کرنے کی یہ ہے کہ ’’لِتُبَشِّرَ‘‘ کے ساتھ بھی ’’بِہٖ‘‘ اور ’’تُنْذِرَ‘‘ کے ساتھ بھی ’’بِہٖ‘‘ آیا ہے۔یعنی دونوں کام بشارت وانذار اسی کتاب ’’قرآن‘‘ کے ذریعے ہوں گے۔ مزید فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ﴾ (المائدۃ:۶۷) ’’اے ہمارے رسول! پہنچایئے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ کی طرف آپؐ کے رب کی جانب سے‘‘۔ تبلیغ کس کی؟ قرآن کی! ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۞﴾ (بنی اسرائیل:۹) ’’بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور بشارت دیتا ہے ان اہل ایمان کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے‘‘۔ بشارت دینے والا کون؟ قرآن!۔اس انداز اور تبشیر بالقرآن کا ذکر سورۃ الکہف کے آغاز ہی میں بڑے مہتم بالشان انداز میں ہوا۔فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۞ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۞﴾

’’شکر اور تعریف کے لائق ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اس نے کوئی کجی نہیں رکھی۔ بالکل سیدھی اور ہموار و استوار تاکہ وہ

لوگوں کو اپنی جانب سے ایک سخت عذاب سے آگاہ کردے اور ایمان لانے والوں کو‘ جو نیک عمل کر رہے ہیں‘ اس بات کی خوشخبری سنادے کہ ان کے لئے بہت اچھا اجر ہے‘‘۔

میں نے جو آیات آپ کو سنائیں ان سب کا حاصل یہ نکلا کہ:

دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مرکز ومحور اور مبنیٰ و مدار صرف اور صرف قرآن ہے۔انذار ہو یا تبشیر‘ تبلیغ ہو یا تذکیر‘ مباحثہ ہو یا مجادلہ‘ موعظہ ہو یا نصیحت‘ یہ تمام کام صرف قرآن مجید ہی کے ذریعے سرانجام دیئے جائیں گے۔

’’دعوت‘‘ کا لفظ ہمارے دین کی غالباً سب سے جامع اصطلاح ہے‘ جس کے لئے سورۃ النحل کی آیت ۱۲۵ سے استشہاد کیا جاسکتا ہے‘ جس میں دعوت کے ضمن میں یہ جامع ومانع ہدایت دی گئی ہے کہ: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ﴾ ’’(اے نبیؐ!) دعوت دو اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ‘ اور لوگوں سے مباحثہ ومجادلہ کرو اس طور سے جو نہایت ہی عمدہ ہو۔‘‘ یہ ہے اسوہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا۔سیرتِ مطہرہ میں آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ کہیں نبی اکرم ﷺ نے طویل تقریر وخطاب فرمایا ہو۔ جہاں تشریف لے گئے تو یہی فرمایا کہ ’’لوگو! میرے اوپر اللہ کی طرف سے ایک کلام نازل ہوا ہے اسے سن لو!‘‘۔ معلوم ہوا کہ فلاں وادی میں کوئی قافلہ آکر اترا ہے تو وہاں تشریف لے گئے اور فرمایا تو یہ فرمایا کہ ’’لوگو! میرے پاس اللہ کا اتارا ہوا کلام ہے‘ وہ میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں‘‘۔ مجمعوں میں آپؐ قرآن پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ہمیں تو قرآن کا ترجمہ کرکے اس کا مطلب اور مفہوم سمجھانا پڑتا ہے‘ جبکہ وہاں معاملہ یہ تھا کہ از دِل خیزد بر دِل ریزد۔ وہاں تو حال یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے قرآن سنا اور سعید روح کے قلب وذہن اور رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن اور محض قرآن سن کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔عمر بن الخطاب کو عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کس نے بنایا؟

قرآن نے! یہ سورۂ طٰہٰ کی معجز نمائی تھی جس نے عمرؓ کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ع
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را!

ابوذر غفاریؓ جو ڈکیتی کا پیشہ رکھنے والے ایک قبیلے کے فرد تھے' انہیں اس مقام تک کس نے پہنچایا کہ ع ''رہزنان از حفظِ اُو رہبر شدند!'' جن کے متعلق نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ''جس نے زہدِ عیسیٰ علیہ السلام دیکھنا ہو تو وہ میرے ساتھی ابوذرؓ کو دیکھ لے!''۔ لبیدؓ شعرائے سبعہ معلقہ کے سلسلے کے آخری شاعر ہیں' ان کے ایک شعر پر سوقِ عکاظ میں تمام شعرائے وقت نے ان کو سجدہ کیا تھا۔ وہ ایمان لے آئے تو قرآن کے ذریعے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ اب شعر نہیں کہتے؟ تو جواب ملا: اَبَعْدَ الْقُرْآن؟ یعنی قرآن کے نزول کے بعد میری کیا مجال کہ میں شاعری کے میدان میں طبع آزمائی کروں۔ طفیلؓ دوسی یمن کے رہنے والے قادر الکلام شاعر تھے۔ جب مکہ آئے تو قریش کے بہکانے پر کانوں میں روئی ٹھونس لی کہ مبادا کانوں میں کلام اللہ پڑ جائے۔ لیکن ایک دن خود ہی رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر قرآن سننے کی فرمائش کرتے ہیں اور جیسے ہی کچھ حصہ سنتے ہیں' بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا' بے شک یہ وحی الٰہی ہے۔ اور اُسی وقت مسلمان ہو جاتے ہیں۔ الغرض اس کتابِ ہدایت کے طفیل' جو رہزن تھے وہ رہبر بن گئے' جو اُمّی تھے' اَن پڑھ تھے وہ دنیا کے لئے معلم بن گئے' جو زانی و شرابی تھے' وہ عصمتوں کے محافظ اور مکارمِ اخلاق کے علمبردار بن گئے۔ یہ سب کچھ قرآن کی معجز نمائی تھی۔

میری اس گفتگو کا نتیجہ بھی یہ نکلا کہ دعوت و انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہجِ عمل پورے کا پورا قرآن مجید کے گرد گھومتا ہے۔ یا سادہ الفاظ میں یوں کہہ لیا جائے کہ نبی اکرم ﷺ کا آلۂ انقلاب ہے قرآن حکیم! اس بات کو مولانا حالی مرحوم نے تو نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

اور علامہ اقبال مرحوم نے اسی بات کو یوں الفاظ کا جامہ پہنایا۔

در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید!

پھر علامہ مرحوم نے حد درجہ پُرشکوہ الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بقرآن زیستن!
آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا است ایں — زندہ و پائندہ و گویا است ایں!
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

اب ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اگر کوئی دعوت اس قرآن سے پرے پرے دی گئی ہو' قرآن کو Bypass کر کے دی گئی ہو' قرآن کے بجائے کسی شخصیت کے لٹریچر کے بل پر چل رہی ہو' کسی اور کی تصانیف پر چل رہی ہو' وطنیت وقومیت کے نام پر چل رہی ہو تو وہ دعوت اُسوۂ رسول ﷺ سے ہٹی ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہتا۔ اُسوۂ رسولؐ تو یہ ہے دعوت و تبلیغ' انذار و تبشیر' تلقین و نصیحت ان سب کا مبنیٰ' مدار اور مرکز و محور صرف اور صرف قرآن ہو گا۔

تربیت وتزکیہ کا مسنون ذریعہ۔ قرآن حکیم

اب آیئے چوتھی بات کی طرف۔ وہ ہے تربیت۔ یہ معاملہ اس اعتبار سے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے کہ تربیت اور تزکیۂ نفس کے بارے میں یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید اس کے لئے تو یہ قرآن مفید ہے ہی نہیں' کتاب اللہ اس کام کے لئے مؤثر ہی نہیں ہے' لہٰذا ذکر کے کچھ اور طریقے ایجاد کرنے پڑیں گے' تربیت کا کوئی دوسرا نظام بنانا پڑے گا۔ گویا نبی اکرم ﷺ کا اسوہ اس کے لئے مکمل رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آنحضور ﷺ کی شخصیت کا جو اثر ہوتا تھا وہ اب ہمارے لئے ممکن نہیں ہے' کیونکہ آپ ﷺ کا وجودِ اقدس ہمارے درمیان موجود نہیں۔ تصوف کے حلقوں

میں جو دیانت دار اور خدا ترس لوگ ہیں' وہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں تربیت' تزکیہ اور سلوک کے جو طریقے رائج ہیں' وہ مسنون بہرحال نہیں ہیں۔ دیانت کا تقاضا ہے کہ ہم بھی اس کو تسلیم کریں۔ ضربیں لگانے کے طریقے کو مسنون ٹھہرانے کے لئے کہاں سے دلیل لائیں گے؟ یہ بات نہ تو کسی حدیث سے ثابت ہے نہ کسی صحابی سے اور نہ ہی کسی تابعی سے۔ جو حضرات اس کے قائل ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ عذر و معذرت یا Plea لاتے ہیں کہ ان طریقوں کو انہوں نے اپنے تجربات میں مفید پایا ہے۔ ٹھیک ہے' مجھے اس سے انکار نہیں۔ ایسا ممکن ہے کہ یہ طریقے مفید ہوں۔ لیکن یہ مانئے اور اس کا اعلان بھی کیجئے کہ یہ طریقے مسنون نہیں ہیں۔ یہ طریقے اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مطابقت نہیں رکھتے۔ کیا ایسے حضرات کا یہ خیال ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے تزکیہ نہیں کیا؟ قرآن حکیم میں تین مقامات پر تلاوت کے بعد تزکیہ ہی کا ذکر آتا ہے۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ۔

اس تزکیہ کا ذریعہ کیا ہے؟ دعوت وتبلیغ کا مدار اور انذار وتبشیر کا مرکز ومحور تو قرآن ہے اور تذکیر ونصیحت کا مبنیٰ بھی قرآن ہی ہے' اس بات کو ہم نے قرآن کی آیات ہی سے سمجھ لیا۔ اس کے سمجھنے کا معاملہ آسان ہے' البتہ تزکیہ کا معاملہ تھوڑا سا باریک ہے۔ تزکیہ وتربیت کے لئے بھی ہمیں ہر حال میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آیئے اس بات کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورۂ یونس (آیت ۵۷) میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لئے ہدایت اور رحمت ہے''۔

چنانچہ دل کے تمام امراضِ دینیہ واخلاقیہ کے لئے شفاء یہ قرآن مجید ہے۔ ذکر' یہ قرآن ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر) جو اس ذکر کو By pass

کرے گا اس کے متعلق کم سے کم یہ بات کہی جائے گی کہ وہ غیر مسنون طریقے پر عمل کر رہا ہے۔ امراضِ قلبیہ وصدریہ کا علاج جو اس سے علیحدہ کیا جائے گا وہ اسوۂ رسول ﷺ نہیں ہوگا۔ اپنی جگہ مؤثر ہوا کرے۔ اسوۂ رسولؐ کے نقشے سے وہ ہٹا ہوا ہے۔

دیکھئے ہمارے ہاں ایک ہے ''وعظ''۔ آج یہ وعظ ہمارے ہاں گالی بن گیا ہے۔ لوگ پھبتی چست کرتے ہیں کہ لو جی وعظ کر رہے ہیں۔ گویا بہت گھٹیا سی بات کہی جا رہی ہے۔ یہ ہر دَور کی ایک چھاپ ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں ایسے وعظ ہوا کرتے تھے جو بہت مؤثر ہوتے تھے۔ سامعین ان سے اپنے قلوب میں گداز اور ایک روشنی محسوس کرتے تھے' ان کے جذبات کو جلا ملتی تھی۔ لیکن ہمارے ہاں' میری یادداشت کے مطابق' جو ''وعظ'' ہوا کرتے تھے ان میں بھی قرآن نہیں ہوتا تھا (الا ماشاء اللہ) اکثر وعظ ''مثنویٔ مولویٔ معنوی'' کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ اس کی بھی ایک تاثیر تھی' اس سے انکار نہیں۔ اکثر ہوتا یہی تھا کہ ایک خاص ترنم آمیز لہجے میں مثنوی کو پڑھا جاتا تھا۔ میرے ہوش کے زمانے میں اکثر وعظوں کی یہی نوعیت ہوتی تھی جو میں نے خود سنے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ موعظہ حسنہ اور نصیحت یہ قرآن ہی ہے۔ دلوں میں اترنے والی چیز یہ قرآن ہے' جذبات کو جلا بخشنے والی چیز یہ قرآن ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اشعار میں بہت سے قرآنی حقائق کی نہایت عمدہ اور اعلیٰ وارفع ترجمانی اور وضاحت کی ہے۔ چنانچہ روایتی واعظوں کے متعلق وہ کہتے ہیں ع ''معنیٔ او پست وحرفِ او بلند'' یعنی الفاظ بڑے بھاری بھرکم اور معنی تلاش کرو تو ہیں ہی نہیں۔ دھواں دھار بات ہے لیکن معنی سے بالکل خالی۔ علامہ مزید کہتے ہیں۔

از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او

یعنی اپنے وعظوں کے لئے حدیث لائیں گے تو کوئی بہت ہی ضعیف یا شاذ حدیث لائیں گے۔ واعظوں کی یہ بڑی کمزوری شمار کی گئی ہے کہ ان کے وعظ میں اکثر و بیشتر کمزور و ضعیف حدیثیں ہوتی ہیں۔ امام غزالیؒ اس سے نہ بچ سکے۔ ''احیاء العلوم'' جیسی کتاب

بھی اس سے مبرا نہیں۔ وہ کسی موضوع پر سات آٹھ صحیح حدیثیں درج کرنے کے بعد دو تین ضعیف حدیثیں بھی شامل کر دیتے ہیں۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا! شاید ان کا جی بھرتا نہیں تھا اور وہ چاہتے تھے کہ دو تین دلیلیں اور دے دی جائیں۔ حالانکہ ایک بات صحیح حدیث سے ثابت ہو جاتی ہو تو پھر اس کے لئے ضعیف احادیث سے استدلال کی کیا ضرورت ہے! ہمارے ہاں جو عام واعظین ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ساری گفتگو اور وعظ کا مرکز ومحور صرف ضعیف احادیث ہوں گی۔ الا ماشاءاللہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی چیز سے ہمارے واعظین کو اعتناء نہیں ہے تو وہ یہ قرآن ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے والد مرحوم کے یہ حد درجہ سادہ مگر پرتاثیر اشعار حواشی ترجمہ قرآن میں درج کئے ہیں۔

سنتے سنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو
کان بہرے ہو گئے دل بے مزہ ہونے کو ہے
آؤ سنوائیں تمہیں وہ نغمۂ مشروع بھی
پارہ جس کے لحن سے طورِ ہدیٰ ہونے کو ہے
حیف گر تاثیر اُس کی تیرے دل پر کچھ نہ ہو
کوہ جس سے خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا ہونے کو ہے!

میں کہا کرتا ہوں کہ ایک محفل سماع جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بھی ہوتی تھی، لیکن اس میں کیا سنا جاتا تھا؟ قرآن۔ ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ (الاعراف: ۲۰۴) ’’اور جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔‘‘ بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمائش کر کے قرآن کریم سننا چاہا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ کو سناؤں! آپؐ پر تو قرآن نازل ہوا ہے۔ آنجناب ﷺ نے فرمایا کہ ہاں سناؤ، مجھے دوسروں سے سن کر حظ اور لطف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی اور جب اکتالیسویں آیت پر آئے تو حضور ﷺ

نے فرمایا: حَسْبُكَ حَسْبُكَ ’’بس کرو، بس کرو!‘‘ حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جب حضرت عبداللہؓ نے یہ آیت پڑھی: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ ’’پس سوچو کہ اُس وقت کیا ہو گا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر (اے محمدؐ) آپ کو گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔‘‘ یہ ہے سماع جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا!

وعظ کا مقصد کیا ہے؟ جذبات کے اندر ایک حرارت پیدا کرنا — کیا یہ حرارت قرآن سے پیدا نہیں ہوتی؟ گویا تزکیہ نفس کے لئے تو غالباً یہ دنیا کی ناکام ترین کتاب سمجھی گئی ہے۔ نعوذ باللّٰہ من ذٰلك۔ نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کی سب سے زیادہ ناقدری اس کوچے میں آ کر ہوئی ہے۔ اس کا مرثیہ بھی اقبال نے کہا ہے۔

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست!
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقر آں محفلش!

عراقی، جامی یا رُومی کا شعر سنیں گے تو وجد میں آ جائیں گے، لیکن قرآن سنیں گے تو کوئی اثر ہی نہیں ہو گا، بلکہ قرآن ان کی محفلوں میں جگہ ہی نہیں پاتا۔ حالانکہ اگر جذبات کی جلا، ان میں حرارت اور سوز وگداز اور کیف وسرور کی کیفیات مطلوب ہوں تو اس مقصد کے لئے بھی یہ قرآن ہے جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اُترا۔ ان کے لئے بھی سب سے بڑا منبع وسرچشمہ قرآن مجید ہی ہے۔

اسوۂ حسنہ کے ضمن میں اب تک قدرے تفصیل کے ساتھ میں نے جو اُسوے گنوائے ہیں، انہیں پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ پہلا اسوہ ہے دعوت وتبلیغ، انذار و تبشیر اور موعظہ وتذکیر، ان سب کو جمع کر لیجئے، ان سب کا مرکز ومحور اور مبنیٰ ومدار ہے قرآن۔ دوسرا اُسوہ ہے تزکیہ وتربیت، اس کی اساس، جڑ اور بنیاد بھی قرآن ہی

ہے۔ ذکر قرآن سے۔ محفل سماع قرآن سے۔ وعظ قرآن سے۔ تطہیر فکر قرآن سے ہوگی‘ اور فکر کی تطہیر ہوگی تو اعمال خود بخود درست ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ انسانی شخصیت فکر وعمل کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں لازم وملزوم ہیں‘ بایں معنی کہ ’’گندم از گندم بروید‘ جوز جو‘‘ کے مصداق غلط فکر‘ غلط عمل ہی کو جنم دے سکتا ہے اور صحیح عمل کے لئے صحیح فکر ناگزیر ہے۔ گویا اگر کسی انسان کی فکر کی تطہیر ہو جائے اور غلط افکار ونظریات اور فاسد خیالات اس کے قلب و ذہن سے پت جھڑ کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں تو اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے برگ و بار بلا تکلف از خود نمایاں ہو جائیں گے۔ اسی عمل (Phenomenon) کو قرآن حکیم ’’یُکَفِّرْ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ‘‘ بھی قرار دیتا ہے اور یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنَاتٍ بھی۔ اور یہی ربط وتعلق ہے اس میں کہ تلاوتِ آیات کے متصلاً بعد تزکیہ کا ذکر قرآن میں آیا ہے: یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ
واللہ اعلم!

تنظیم کے لئے اُسوۂ رسولؐ سے رہنمائی

اب آیئے دوسرے مرحلے کی طرف یعنی تنظیم و ہجرت ___ تنظیم کے ضمن میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا کیا اسوہ رہا ہے! اب اس مسئلہ کو ہمیں سمجھنا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تنظیم کے بغیر کوئی بھی اجتماعی کام نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ آپ کو لوگوں کی جیبیں کاٹنی ہوں تو بھی ایک تنظیم قائم کرنی پڑتی ہے۔ گرہ کٹوں کے بھی گروہ (Gangs) ہوتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالنا ہو تو گینگ بنانا ہوگا۔ سوشلزم لانا ہو تو آپ کو تنظیم بنانی ہوگی۔ اور اگر اسلام کے لئے کوئی کام کرنا ہے تو بھی تنظیم سے مفر نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ۔ یعنی جماعت کے بغیر کوئی اسلام نہیں۔ اور نبی اکرم ﷺ کا تو حکم ہے کہ:

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))

’’(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں: (i) جماعت کا‘ (ii) سننے کا‘ (iii) اطاعت کرنے کا‘ (iv) ہجرت کا‘ اور (v) اللہ کے راستے میں جہاد کا۔‘‘

ہمارا آج کا مزاج اس سے کافی دور چلا گیا ہے۔ بڑے بڑے اہل دانش وبینش اور صاحب علم وفضل کہتے ہیں ’’اجی جماعت کی کیا ضرورت ہے؟ کام تو ہم بھی کر ہی رہے ہیں‘ نماز روزہ تو ہو ہی رہا ہے‘ کسی کی کوئی خدمت بھی کر دی جاتی ہے۔‘‘ اگر واقعی کوئی کام کرنا ہے‘ اگر اسوۂ محمدیؐ پیش نظر ہے اور انقلابِ محمدیؐ کو دنیا میں دوبارہ لانے کی سعی و جہد کرنی ہے تب تنظیم سے رستگاری نہیں ہوسکتی‘ تنظیم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ آج کے دور کا سب سے کٹھن کام یہی ہے۔ دیکھئے قرآن مجید (سورۂ مریم) میں عرب کے لوگوں کو قَوْمًا لُّدًّا کہا گیا ہے کہ یہ بڑی جھگڑالو قوم ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ پر فرعونِ بے ساماں ہے‘ کون کسی کی سنے گا! کون کسی کے سامنے سر جھکائے گا! آج کا دور بھی ایسا ہی دور ہے کہ سب سقراط و بقراط ہیں‘ کون کسی کی سنے گا! لوگوں کے اپنے اپنے نظریات اور خیالات ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ اس دور میں کسی نظم کا پابند ہونا سب سے کٹھن کام ہے۔ کسی کی بات مانی جائے‘ کسی کا حکم مانا جائے‘ خود کو کسی ڈسپلن میں دے دیا جائے‘ سمع وطاعت کا نظم قبول کیا جائے‘ یہ بڑا مشکل اور کٹھن کام ہے۔

میرے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قربانیوں میں سب سے بڑا ایثار یہی تھا کہ انہوں نے اپنی شخصیت کی کامل نفی کر کے اس کو نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس میں گم کر دیا تھا ___ حالانکہ بہت سے دنیوی اعتبارات سے آپؓ نبی اکرم ﷺ سے آگے تھے۔ حضور ﷺ کے پاس اپنا ذاتی سرمایہ کوئی نہیں تھا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ﴾ ’’اور تمہیں نادار پایا اور پھر مالدار کر دیا‘‘۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جب غنی کیا ہے تو سرمایہ اہلیہ محترمہ کا تھا۔ نقل کفر کفر نہ باشد‘ طائف والوں نے یہی طعنے تو دیئے تھے کہ اللہ کو ایک مفلس وقلاش کے سوا اپنا نبی بنانے کے لئے کوئی اور نہیں ملا تھا؟ مکہ والے بھی کہا کرتے تھے کہ اللہ کو نبی بنانا تھا تو دو عظیم شہروں (مکہ اور

طائف) میں سے کسی صاحب ثروت سردار کو بناتا۔ حضور ﷺ کے پاس قریش کے اس قبائلی نظام کا کوئی منصب نہیں تھا' جبکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سب سے زیادہ نازک اور حساس ذمہ داری تھی۔ یعنی دیت کا فیصلہ کرنا۔ آپؓ کے اختیار میں تھا کہ کسی مقتول کا کتنا خون بہا دیا جائے گا— گویا اس معاشرے میں کسی کی معاشرتی حیثیت (Social Status) کے تعین کرنے کا کام آپ کے سپرد تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ اس معاشرے کے قبائلی نظام میں حضرت ابوبکرؓ کو کیا مقام حاصل تھا! لیکن انہوں نے اپنی شخصیت کی ایسی نفی کی ہے اور اپنے آپ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں اس طرح گم کیا ہے کہ ''ابوبکر'' تو نظر ہی نہیں آتے۔ نظر تو وہ آیا کرتا ہے جو اختلاف کرتا ہے۔ ایسے شخص کی شخصیت علیحدہ اور جدا نظر آئے گی جو کسی درجے میں اپنی بات کرتا ہو۔ لیکن جس کی اپنی کوئی بات ہی نہیں ہے' جو خود کو گم کر چکا ہو محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں' وہ کہاں نظر آئے گا!— یہ ہے حضرتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا ایثار اور سب سے بڑی قربانی۔

آج جو سب سے بڑا خناس ہمارے دماغوں میں بیٹھا ہوا ہے وہ یہی انانیت ہے۔ کوئی نظم ہوگا اور کوئی تنظیم ہوگی تو بہر حال اس کے امیر اور اس کے نظام العمل کی پابندی بھی کرنی ہوگی۔ لہٰذا اپنے آپ کو اس ''کھکھیڑ'' سے بچانے کے لئے یہ فلسفہ تراش لیا جاتا ہے کہ اجی کسی جماعت یا تنظیم کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دین کا کام کسی نہ کسی درجے میں ہم بھی کر ہی رہے ہیں۔ جماعتیں اور تنظیمیں تو عموماً فتنہ بن جایا کرتی ہیں۔ اس لئے اس سے حذر ہی بہتر ہے۔ ان حیلوں سے دل کو مطمئن کر لیا جاتا ہے۔ لوگ سڑک پر چلتے ہوئے حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں' لیکن اس کے باوجود باہر نکلنا ترک نہیں کرتے۔ دل میں اصل چور یہی ہے کہ میں کیوں کسی کی مانوں؟ لیکن یہ جان لیجئے کہ تنظیم و جماعت کے بغیر دنیا میں کبھی کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

تنظیم نبویؐ کی نوعیت

اب رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں مجھے تنظیم و ہجرت کے بارے میں

کچھ عرض کرنا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی تنظیمیں دو نوعیتوں کی تھیں۔ ایک تنظیم کی نوعیت تو یہ تھی کہ' آپ ﷺ کے بر بنائے نبی و رسول ہونے کے' جو شخص آپؐ پر ایمان لے آیا' اس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا' تو وہ خود بخود بحیثیت مؤمن آپ کا مطیع و فرماں بردار ہو گیا اور آپ سے آپ اس بڑی تنظیم میں شامل ہو گیا جس کو امت مسلمہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اب کسی دوسری تنظیم کی حاجت ہی نہیں۔ وہ حضور ﷺ کے احکام کا پابند ہے۔ آپ ﷺ کی اطاعت سے سرمو انحراف کرے گا تو اس کا ایمان ہی سلامت نہیں رہے گا۔ اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا دنیا میں وجود ممکن ہی نہیں ہے۔ دنیا میں ہر شخص کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے' لیکن رسول اللہ ﷺ سے تو اختلاف ممکن نہیں۔ اختلاف کیا تو ایمان کی خیر نہیں— اختلاف کرنا تو دور رہا' بات مان بھی لی لیکن اگر دل میں کوئی اضطراب یا تنگی رہ گئی تو بھی ایمان کی خیر نہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝﴾ (النساء:٦٥)

''نہیں (اے محمد ﷺ!) آپؐ کے ربّ کی قسم یہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپؐ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ آپؐ فیصلہ کریں اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔''

آپ نے دیکھا کہ آنجناب ﷺ کے حکم کو تسلیم نہ کرنے پر ہی نہیں بلکہ آپ کے فیصلوں کو خوش دلی سے قبول نہ کرنے پر بھی ایمان کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھا کر نفی فرما رہے ہیں—— پھر دیکھئے سورۃ الحجرات میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝﴾ (آیت ۲)

''اے اہل ایمان! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ ہی ان سے اونچی آواز میں بات کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے

هوئے بلند آوازی اختیار کرتے ہو' مبادا تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں (تمہاری ساری نیکیاں اکارت جائیں' تمہارے اب تک کئے کرائے پر پانی پھر جائے) اور تمہیں شعور واحساس تک نہ ہو''۔

شعور واحساس تو تب ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ غور کیجئے کہ یہاں نافرمانی' حکم عدولی اور معصیتِ رسولؐ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا' بلکہ مجرد سوئے ادب کی وجہ سے سارے اعمال کے حبط ہونے کی وعید سنائی جا رہی ہے۔

آگے چلئے اور دیکھئے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسول کے لئے کتنا محکم اور غیر مبہم ضابطہ وقانون بیان فرمادیا ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰) ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''۔اسی ضمن میں خود نبی اکرم ﷺ کا قول بھی سن لیجئے: ((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ)) ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی خواہش نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں''۔قرآن وحدیث کی یہ تعلیمات و ہدایات پیش نظر رکھئے اور غور کیجئے کہ اس سے زیادہ مضبوط کسی اور تنظیم کا آپ تصور کرسکتے ہیں؟

مسنون ہیئتِ تنظیمی۔بیعت سمع وطاعت

واقعہ یہ ہے کہ میں نے اس مسئلہ پر کافی طویل عرصے تک بہت غور کیا ہے اور آپ کو بھی غور وفکر کی دعوت دیتا ہوں کہ آنحضور ﷺ نے مختلف مواقع اور اوقات میں صحابہ ؓ سے جو بیعتیں لی ہیں' ان کی کیا ضرورت تھی؟ نبی اکرم ﷺ تو اپنی ذات میں خود مطاع ہیں' پھر بیعت کی ضرورت کیا ہے؟ غزوۂ بدر سے پہلے جو مشاورت ہوئی ہے کہ آیا قافلے کا رخ کیا جائے جس میں صرف پچاس نفوس ہیں یا اُس لشکر کا جو پوری طرح کیل کانٹے سے لیس اور ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ہے' تو اسی موقع پر ہی تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے' جو قبیلہ خزرج کے سرداروں میں سے تھے'

یہ بات کہی تھی کہ: اِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ یعنی حضور! ہم آپؐ پر ایمان لا چکے' آپؐ کی بحیثیت رسول اللہ تصدیق کر چکے' اب کوئی Option ہمارے لئے کہاں رہ گیا ہے؟۔انہوں نے مزید عرض کیا کہ آپ ہمیں ساحل کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر میں چھلانگ لگانے کا حکم دیجئے' ہم تعمیل کریں گے۔ آپ ہمیں برک الغماد تک (جو یمن کا ایک دوردراز علاقہ ہے) چلنے کا حکم دیجئے' ہم چلیں گے' چاہے ہماری اونٹنیاں لاغر ہو جائیں۔ لیکن اس کے باوجود مختلف مراحل پر آپؐ نے بیعتیں کیوں لیں؟۔ اس سوال کے جواب کو اس وضاحت سے سمجھئے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر تھا کہ عرب میں انقلاب بھی آجاتا اور اپنے محبوب ﷺ کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی نہ چبھتا۔اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں نہیں کیا؟ اس لئے نہیں کیا کہ نبی اکرم ﷺ کی اسلامی انقلاب کی انسانی سطح پر جدوجہد ہمارے لئے نمونہ بنے۔اسی طرح صحابہ کرام ؓ سے حضور ﷺ کو کسی بھی موقع پر بیعت لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن بایں ہمہ آپؐ نے بیعتیں لیں تاکہ امت کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی نظم جماعت کی بنیاد بیعت ہے۔

حدیبیہ کے موقع پر جب حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی خبر پہنچتی ہے تو نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام ؓ کو دعوت دیتے ہیں کہ کون عثمانؓ کے خون کا قصاص لینے کے لئے میرے ہاتھ پر سرفروشی کی بیعت کرتا ہے! اس پکار پر چودہ سو جان نثار صحابہ کرامؓ لبیک کہتے ہیں۔ وہ تو حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر ہی غلط نکلی ورنہ صحابہ کرامؓ نے تو جان فروشی کے لئے خود کو پیش کر ہی دیا تھا۔ اسی بیعت کا نام ''بیعت رضوان'' ہے' جس کا ذکر سورۃ الفتح میں بڑے مہتم بالشان طریقے سے دوجگہ آیا ہے۔آیت نمبر۱۰ میں فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ﴾

''(اے نبیؐ) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے تھے' وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے' ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا''۔

آگے آیت نمبر ۱۸ میں ان بیعت کرنے والوں کو بایں الفاظ بشارت دی جاتی ہے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾

''اللہ ان مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے (اے نبی!) آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ کو ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ اسی لئے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو قریبی فتح بخشی''۔

بیعت عقبہ ثانیہ ہو رہی ہے کہ آپ سے عرض کیا جاتا ہے کہ حضور آپ مدینہ تشریف لے آیئے، ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے بال بچوں کی کرتے ہیں۔ بیعت کرنے والے وہ ہیں جو پہلے ہی سے ایمان لا چکے ہیں۔ قول وقرار کے لئے بیعت ہو رہی ہے۔ معاہدے ہو رہے ہیں۔ احادیث میں مختلف بیعتوں کا ذکر ہے۔ میں یہاں صرف ایک حدیث بیان کر رہا ہوں جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں اور جسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اپنی اپنی ''صحیح'' میں لائے ہیں۔ گویا یہ حدیث متفق علیہ ہے جو حدیث کا سب سے بلند مقام ومرتبہ ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

عَنِ ابْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كُنَّا اِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا: ((فِيْمَا اسْتَطَعْتُمْ))

''ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ہم جب رسول اللہ ﷺ سے سمع و طاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ فرماتے کہ ''جس چیز کی تم طاقت رکھو''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف اوقات میں مختلف کاموں کے لئے بیعت لیا کرتے تھے۔

بیعت کا یہ نظام جو ہمیں تعلیم دیا گیا ہے یہ درحقیقت اس تنظیم کی اساس و بنیاد ہے کہ جو اس کام کو کرنے کے لئے منظم ہو جو نبی اکرم ﷺ امت کے حوالے کر گئے ہیں۔ یعنی عالمی سطح پر انقلابِ محمدیؐ کا بول بالا کرنا۔ اس کام کے لئے طریق تنظیم یہ بیعت کا نظام ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ جب آگے آئے اور پکارے کہ ''مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ'' تو آپ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیں اور سمع وطاعت کی بیعت کریں۔ فرق یہ ہوگا کہ نبی

اکرم ﷺ سے جو بیعت کی جاتی تھی، وہ مطلق ہوتی تھی کہ جو حکم آپؐ دیں گے وہ واجب الاطاعت ہوگا۔ اس لئے کہ ع گفتۂ او گفتۂ اللہ بود۔ ان کا فرمان اللہ کا فرمایا ہوا تھا۔ اور ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ اب جو بیعت ہو گی، وہ مشروط ہو گی۔ یہ اطاعت ''فی المعروف'' کی شرط کے ساتھ مشروط ہو گی۔ پس نبی اکرم ﷺ کا تیسرا اسوہ ہے کسی تنظیم کے قیام کے لئے نظامِ بیعت۔

احیائے دین اور اقامت دین کی جدوجہد کے لئے دستوری تنظیموں اور الیکشنوں کے ذریعے قائم ہونے والی تنظیموں اور امیر اور شوریٰ یا انتظامیہ کے لئے دو سال یا پانچ سال کے بعد الیکشن اور ان کے درمیان فرائض و اختیارات اور حقوق کا توازن قائم کرنے کے طریقہ کار کو میں کفر یا قطعی طور پر خلافِ اسلام نہیں کہتا، لیکن پورے شرح صدر کے ساتھ یہ ضرور کہتا ہوں کہ یہ طریقِ تنظیم اسوۂ رسول کے مطابق نہیں ہے۔ میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کو تو بیعت لینے کی احتیاج ہی نہ تھی۔ حضورؐ نے مختلف اوقات میں جو بیعتیں لیں وہ میرے نزدیک اس لئے تھیں کہ آئندہ کے لئے ہمیں روشنی ملے اور حضور ﷺ کا طرزِ عمل ہمارے لئے اُسوہ بنے۔ لہٰذا حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا نصب ہو رہا ہے تو بیعت کی بنیاد پر۔ حضرت عمر فاروقؓ کا ہو رہا ہے تو بیعت سے۔ حضرت عثمان غنیؓ کا ہو رہا ہے تو بیعت پر۔ حضرت علیؓ کا نصب خلافت بھی بیعت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ اس کے بعد بیعتیں تقسیم ہو گئیں۔ یہاں تک تو بیعت ایک تھی۔ وہ دینی بیعت بھی، سیاسی بیعت بھی اور انتظامی بیعت بھی تھی، لیکن خلافت راشدہ کے بعد یہ وحدت ختم ہو گئی۔ اس دور میں نظامِ حکومت کا عنوان تو خلافت ہی رہا لیکن اصلاً وہ ملوکیت میں تبدیل ہو گیا اور خلفاء تقویٰ کے لحاظ سے اس معیار مطلوب کے مطابق نہ رہے جو خلفائے راشدین میں نظر آتا تھا، لہٰذا بیعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ ایک سیاسی بیعت یعنی خلیفہ وقت کی اطاعت کے لئے ہوتی تھی جو بتدریج ایک معروف کا درجہ حاصل کر گئی جو دورِ بنی اُمیہ، بنو عباس اور دورِ عثمانیہ تک ہمیں کسی نہ کسی صورت میں نظر

آتی ہے۔اور دوسری بیعت ''بیعت ارشاد'' کسی بزرگ' خداترس' متقی' متدّین مزّکی و
مرّبی اور مرشد کے ہاتھ پر ہونے لگی۔ پھر اس بیعت ارشاد کے بھی کئی سلاسل وجود میں آ
گئے۔ جیسے فقہی مسائل میں چار مسالک فقہ مشہور ہوئے اسی طرح انفرادی رشد وہدایت
اور تزکیہ وتربیت نفس کے لئے بھی چار سلاسل مشہور ہیں۔

اس بات کو بھی سمجھ لیجئے کہ یہ دو بیعتیں اُس وقت تک رائج رہیں جب تک شریعت
اور قانونِ اسلام کا ڈھانچہ قائم (intact) رہا۔ تاآنکہ وہ دور شروع ہوا جب ایک
طرف وحدتِ ملی پارہ پارہ ہوئی اور دوسری طرف متعدد مسلم ممالک براہ راست سیاسی
طور پر مغربی استعمار کے استیلاء کے پنجے میں گرفتار ہو کر سیاسی طور پر غلامی سے دوچار
ہوئے اور ہمارے دین کا برائے نام ڈھانچہ بھی برقرار نہ رہا اور پوری عمارت زمین
بوس ہوگئی۔شریعت اور اسلامی قانون مختلف ممالک میں مختلف ادوار میں منسوخ کر دیا
گیا اور قاضیوں کی عدالتیں برطرف کر دی گئیں۔ان حالات میں تجدید واحیائے دین
کی تحریکیں اور تنظیمیں ابھرنے لگیں۔اور پھر ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ دونوں بیعتیں یکجا جمع
ہوگئیں۔سوڈان میں مہدی سوڈانی ابھرے۔طرابلس (موجودہ لیبیا) میں سنوسی تحریک
اور نجد میں محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک اٹھی (جو وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہے)۔
یہ تمام تحریکیں بیعت کے نظام پر سمع وطاعت اور ہجرت وجہاد کے لئے برپا ہوئیں۔اس
طرح ہمیں ان تحریکوں میں اس سنتِ بیعت کی تجدید نظر آتی ہے۔

سید احمد بریلویؒ کی تحریک میں عجب شان نظر آتی ہے۔وہ مسلک کے اعتبار سے
حنفی ہیں' مستند عالمِ دین بھی نہیں' لیکن ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں امام
الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خانوادے کے چشم و چراغ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بھی شامل ہیں'
جو اہل حدیث ہیں۔آج برعظیم پاک وہند میں جو اہل حدیثیت ہمیں نظر آتی ہے وہ کُل
کی کُل ان ہی کی مساعی کا ظہور ہے۔لیکن وہ بیعت جہاد ایک حنفی کے ہاتھ پر کر رہے
ہیں۔سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے پہلے بیعت ارشاد لی' پھر بیعتِ جہاد لی۔اس طرح
ایک ہی شخصیت میں دونوں بیعتیں جمع ہوگئیں۔یہ تو بیسویں صدی میں مغرب کے سیاسی

استیلاء کے ساتھ ذہنی مرعوبیت کے پیشِ نظر دستوری اور قانونی تنظیمیں قائم ہونی شروع
ہوگئیں' ورنہ اس سے قبل اس قسم کی کسی تنظیم اور جماعت کی تشکیل کا کوئی سراغ ہمیں اپنی
تاریخ میں نہیں ملتا۔صحابہؓ وتابعین کے دور میں صدارتی نظام کہیں نظر نہیں آتا کہ اتنے
سال کے بعد صدر ہٹ جائے اور پھر دوبارہ انتخاب ہو۔ وہاں تو یہ نظر آتا ہے کہ جس
کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تھی وہ تاحینِ حیات ہوتی تھی۔آپ کو ایک مقصد پورا کرنا ہے'
جب امیر وہ مقصد پورا کر رہا ہے تو آخر کس دلیل سے آپ اس کو الیکشن کے ذریعے بدلنا
چاہیں گے؟ ہاں اگر وہ مقصد سے ہٹ گیا ہے تو آپ اپنا راستہ علیحدہ کر لیں' بیعت فسخ
کریں اور اپنے طور پر کام شروع کریں۔کوئی اور ایسا نظر آئے جس پر اطمینان ہو کہ وہ
بہتر کام کر رہا ہے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔حاصل بحث یہ ہے کہ تجدید واحیائے
دین کے لئے کام کرنے کا جو طریقہ سنت نبویؐ اور تعامل سلف صالحین سے ثابت ہے وہ
بیعت کا نظام ہے۔اس کے علاوہ جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں' وہ اسوۂ رسول اور
سنت سے ہٹے ہوئے ہیں۔

یہ باتیں کہتے ہوئے دل روتا ہے کہ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ جس طرح
ہمارے ہاں ''وعظ'' گالی بن گیا ہے جو قرآن کی اصطلاح ہے' اسی طرح ''بیعت'' کے
ساتھ' جو خالصتاً قرآن وسنت کی اصطلاح ہے' ذہن میں فوراً دکانداری کا تصور آتا
ہے۔ قبے' عمامے' جبے اور ایک خاص اندازِ نشست و برخاست اور ایک خاص اندازِ
گفتار کے ساتھ کسی شخصیت کا نقشہ ذہن میں اُبھرتا ہے' جن کے ساتھ مریدین کا ایک
حلقۂ خدام ادب کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے۔اس کے سوا کچھ نہیں۔اگر بہت ہوگا تو
یہ کہ کچھ ذکر کے حلقے ہو جائیں گے۔اللہ اللہ خیر صلا۔ اس سے آگے ان کی کوئی دعوت
نہیں۔اس طرح ہم نے اس بیعت کو بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم نے کس چیز کو
بدنام نہیں کیا ہے؟ بقول اقبالؒ

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؒ و چادرِ زہراؓ

ہم نے ہر چیز بیچ کھائی ہے۔دکان دار ہم ہیں۔ بدنام ہم نے دین کو کیا ہے— حج اور عمرے کے مواقع پر اسمگلنگ ہم کرتے ہیں لیکن بدنام حج ہوتا ہے۔صوم وصلوٰۃ کے ساتھ سودی لین دین' بلیک مارکیٹنگ' ذخیرہ اندوزی' ملاوٹ اور بہت سی بدمعاملگیاں ہم کرتے ہیں اور بدنام دین ہوتا ہے— لیکن بایں ہمہ اگر ہم چاہتے ہیں اسوۂ رسول کی پیروی کریں تو بیعت خواہ کتنی ہی بدنام ہو چکی ہو ہمیں تو اسی پر چلنا ہے۔اگر وعظ گالی بن گیا ہے تو بنا کرے' ہمارے لئے تو قرآن ہی وعظ ہے۔ازروئے الفاظ قرآنی:﴿يَآاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۞﴾۔لٹریچروں سے دعوتیں چلتی ہوں تو چلا کریں' ہمارا لٹریچر تو قرآن ہے۔اسی کو پڑھو اور پڑھاؤ۔اسی کو سمجھو اور سمجھاؤ۔اسی کی شرح و وضاحت کرو' تحریر سے بھی' تقریر سے بھی۔ ہر ایک کی اساس قرآن ہو۔بفحوائے ارشادِ ربانی:﴿ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾اور بموجب فرمانِ نبوی: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً))

آپ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ میں قرآن حکیم کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ پر غور و فکر کے نتیجے میں جو بات مجھ پر منکشف ہوئی ہے اس پر الحمد للہ عمل بھی شروع کر دیا ہے۔وہ یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کوئی اضافی نیکی نہیں بلکہ میرا اور ہر مسلمان کا فرض عین ہے۔اس کے لئے تنظیم کا قیام لازم ہے اور اس تنظیم کی ہیئت تشکیلی بیعت کے نظام پر ہونی عین سنت کا تقاضا ہے۔ میں اگر محض درس قرآن ہی دیتا رہتا اور سیرتِ مطہرہ کا بیان ہی کرتا رہتا لیکن قرآن حکیم اور سیرتِ مبارکہ سے جو پیغام اور تعلیم مجھے ملتی' اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہ کرتا تو مجھ سے بڑا ڈھونگ باز کوئی اور نہ ہوتا۔ میں درس قرآن' سیرتِ مطہرہ کے بیان اور وعظ کہنے کی حیثیت سے بہت مشہور (Popular) ہو گیا ہوں۔تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ میرے درسِ قرآن کو پاکستان ہی میں نہیں بہت سے بیرونی ممالک میں بھی انتہائی قبول عام حاصل ہوا ہے۔ میں یہی کام کرتا رہتا اور کبھی عمل کی دعوت نہ دیتا تو میرا خیال ہے کہ اس وقت اگر یہاں چار پانچ سو کی حاضری ہے تو ایسی صورت میں یہ حاضری ہزاروں سے متجاوز

ہوتی۔اس لئے کہ ہمارے ہاں صرف ''سننے'' کا انتہائی ذوق وشوق ہے۔ہم سُنّی ہیں اور خالص ''سُنّی'' ہیں۔ یہ جو بار بار عمل کی دعوت دی جاتی ہے اور غلط کاموں پر جو ڈانٹ پڑتی ہے' اسے آدمی ایک دفعہ سن لے گا' دو مرتبہ سن لے گا' بار بار کون سننے آئے گا؟ میرے چند قریبی واقف کار میرے پیچھے جمعہ پڑھنا چھوڑ گئے۔انہوں نے مجھ سے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ تمہاری تقریر بہت سخت ہوتی ہے۔تم کاروبار میں سود کی آمیزش پر قرآن و حدیث کے حوالے سے تنقیدیں کرتے ہو اور وعیدیں سناتے ہو۔تم متعدد غیر اسلامی معتقدات اور رسوم و رواج پر شدید گرفت اور نکیر کرتے ہو۔ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اور جن حالات سے گزر رہے ہیں' ان میں ان کا ترک کرنا ہمارے لئے مشکل ہی نہیں محال ہے۔تمہاری تقریریں سن کر ہمارا ضمیر ملامت گر ہمیں سرزنش کرتا ہے۔اس کشمکش سے بچنے کے لئے ہم نے تمہارے پیچھے جمعہ پڑھنا اور تمہارے درس میں شریک ہونا ہی چھوڑ دیا ہے۔اگر مجھے صرف درس قرآن اور محض علمی نکات ہی کو بیان کرنا ہوتا تو موجودہ حاضری سے دس گنا زیادہ حاضری ہو سکتی تھی۔ لیکن میں قرآن کا عملی پیغام پیش کرتا ہوں' صرف علمی نکات پیش کرنا اور اس میدان میں موشگافیاں کرنا ذہنی عیاشی بن جائے گی۔میرا قلب و ذہن مجھ سے پوچھتا ہے کہ اگر تم نے صرف یہی کچھ کیا تو اللہ کے ہاں کیا جواب دو گے؟ تم نے سب کچھ ہضم کر لیا ہے' اگر اس قرآن کو بھی ہضم کر گئے تو﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۞﴾ (المرسلٰت) ''پس اس کے بعد کون سی بات ہے جس پر تم ایمان لاؤ گے؟''۔

خلاصۂ بحث

یہ چند باتیں بطورِ جملہ ہائے معترضہ درمیان میں آ گئیں۔اب خوب توجہ سے میری آج کی تقریر کا خلاصہ پھر سن لیجئے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں نے اپنے فہم کی حد تک قرآن کا جو پیغام سمجھا ہے' وہی پیغام ہمیں احادیث میں ملتا ہے اور وہی پیغام ہمیں سیرتِ مطہرہ سے ملتا ہے۔اسی بات کو میں نے آج اسوۂ حسنہ کے حوالے سے

آپ کے سامنے رکھا ہے۔اور وہ اُسوۂ حسنہ یہ ہے:

محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت کسی تبلیغی، رفاہی، اصلاحی، علمی وتحقیقی اور سیاسی نوعیت کی نہیں تھی، بلکہ خالص انقلابی نوعیت کی دعوت تھی۔ یہ تمام کام اس میں بطور اجزاء شامل تھے۔ چنانچہ اس دعوت کے نتیجے میں جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا ہوا، اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی۔ عقائد ونظریات، سیرت وکردار، نظام حکومت وسیاست، علوم وفنون، قانون و اخلاق، تہذیب وتمدن اور معاشرت ومعیشت، الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

یہ انقلابی جدوجہد خالص انسانی سطح (Human Level) پر قدم بقدم چل کر کی گئی اور ایک انقلابی جدوجہد کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، وہ سب مراحل نبی اکرم ﷺ کی اس انقلابی دعوت کو بھی پیش آئے۔ اللہ کی نصرت وتائید بھی حاصل ہوئی لیکن اُس وقت جب نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جان نثار صحابہ کرام ؓ نے اپنی امکانی حد تک اس جدوجہد میں مثالی قربانی اور ایثار پیش کیا۔

آپ ؐ کی جدوجہد جن مراحل سے گزری ان کو دو دو الفاظ کے جوڑوں کے ساتھ میں نے تین حصوں میں منقسم کر کے قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

☆ پہلا مرحلہ: دعوت وتربیت

☆ دوسرا مرحلہ: تنظیم وہجرت

☆ تیسرا مرحلہ: جہاد وقتال

اس مختصر وقت میں، میں نے کوشش کی ہے کہ دعوت وتربیت اور تنظیم وہجرت کے ضمن میں ضروری نکات آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ دعوت وتربیت کے مرحلے کے متعلق میں نے آپ کے سامنے چند اہم نکات اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بیان کر دیئے ہیں۔ دعوتِ ایمان قبول کرنے والوں کی تنظیم تو آپ سے آپ ہو جاتی تھی، کیونکہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور آپ کو رسول اللہ تسلیم کرنے کا لازمی تقاضا تھا کہ تمام اہل ایمان، ایک

تنظیم، ایک جماعت اور ایک اُمت بن جائیں اور اللہ اور اس کی رسول کے احکام کی بے چون وچرا تسلیم ورضا کی کیفیات کے ساتھ پیروی کریں۔ پھر ہجرت تو تنظیم کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ کچھ اختیار کرو گے تو کچھ ترک بھی کرنا پڑے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنی ہے تو ہر اُس چیز کو چھوڑنا ہو گا جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہے۔ کسی سے جڑو گے تو کسی سے کٹو گے بھی۔ سیدھی سیدھی بات ہے۔ دین پر عمل کرنے کے باعث آج اپنے دوست سے کٹے تو کل اپنے بھائی سے کٹو گے۔ ہوسکتا ہے کہ بیوی سے بھی کٹنا پڑ جائے۔ ہوسکتا ہے وہ وقت بھی آ جائے کہ ہر ایک چیز سے کٹنا پڑ جائے۔ تو جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر پختہ یقین رکھتے ہیں، وہ کٹ جایا کرتے ہیں۔ وہ گھربار کو حتیٰ کہ وطن کو بھی چھوڑ کر ایسے نکل جاتے ہیں جیسے جانتے ہی نہیں تھے کہ یہ ہمارا وطن تھا۔ لیکن جو کسی اصول کی خاطر ایک دوست اور ایک بھائی سے نہ کٹ سکا وہ اللہ اور اس کے دین کے لئے اپنا وطن کیسے چھوڑ دے گا؟ جو ایک پیسے میں امین ثابت نہ ہو کیا وہ لاکھ روپے میں امین ثابت ہو گا؟ جو چھوٹا سا وعدہ پورا نہ کر سکے، وہ بڑے بڑے وعدے پورے کرے گا؟ یہ باتیں ناممکنات میں سے ہیں۔ ہجرت تنظیم کے ساتھ بطور ضمیمہ منسلک ہے۔

پھر جہاد ہے۔ ''جہاد'' دراصل اس جدوجہد کا نام ہے جس میں ایک بندۂ مؤمن باطن میں اپنے نفس سے اس کو اللہ اور رسول کا مطیع وفرمانبردار بنانے کے لئے کشمکش کرتا ہے، اور ظاہر میں دعوتِ حق کی تبلیغ کے لئے بھاگ دوڑ، سعی وکوشش اور اس کے قیام کے لئے محنت ومشقت بھی اسی جہاد میں شامل ہوتی ہے۔ پھر قتال ہے۔ جب بھی اس کا مرحلہ آ جائے تو ایک بندۂ مومن اس کے لئے تیار بھی رہے اور اس کی تمنا کی دل میں پرورش بھی کرتا رہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس شخص نے نہ تو اللہ کے راستے میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں اس کی تمنا پیدا ہوئی اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوئی''۔

اہل ایمان سے مطلوب رویہ

سورۃ الاحزاب میں زیر درس آیت ﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ کے بعد کی دو آیات یہ ہیں:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ز وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝﴾ (آیات ۲۲،۲۳)

''اور سچے مومنوں کا حال یہ تھا کہ جب انہوں نے (غزوۂ احزاب کے موقع پر) حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا[1] اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا ہے (یعنی وہ صبر و ثبات سے ڈٹے بھی رہے) اور ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا (یعنی اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکا) اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے۔ اور انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی''۔

اس آیت میں ''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ'' خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ ایک مؤمن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ بڑے ذوق و شوق اور اشتیاق کے ساتھ اس بات کا منتظر رہے کہ کب وہ وقت آئے کہ وہ اللہ کی راہ میں گردن کٹا کر سرخرو ہو۔ اس لئے کہ سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۱۱۱ کی رو سے اہل ایمان اللہ سے سودا کر چکے ہیں اور جنت کے عوض اپنا مال اور اپنی جان اس کے ہاتھ بیچ چکے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ط وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ (التوبة: ۱۱۱)

''یقیناً اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پھر قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے ان کے اس طرز عمل پر پختہ وعدہ ہے تورات میں بھی،

(۱) اشارہ ہے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵۵ کی طرف

انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو! پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ چکا لیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس آیت شریفہ میں لفظ ''بیع'' جس سے ''بیعت'' بنا ہے پوری جامعیت کے ساتھ قول و قرار اور عہد و پیمان کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس آیت کی رو سے مؤمنین تو اپنے مال اور اپنی جان اللہ کے ہاتھ بیچ چکے۔ اب جب بھی یہ مرحلہ آئے تو وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کی یہ امانت اسے لوٹانے کے لئے میدانِ کارزار میں نکلیں گے۔ لیکن اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مرحلہ کب آئے گا۔ آگے کے مراحل کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ پتہ نہیں کہ کب کیا مرحلہ آ جائے اور کیا صورت حال پیدا ہو جائے! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دعوت دیتا رہے اور اسی میں اس کی زندگی تمام ہو جائے اور اس کو ایک ساتھی بھی نہ ملے۔ نبیوں کے باب میں بھی ایسا ہوا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ تمکن عطا فرما دے۔ اس کا دار و مدار ہماری سوچ پر نہیں ہے۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ تو مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے تھے۔ مدینہ کی کھڑکی تو اللہ نے خود کھولی۔ مکہ میں اہل یثرب کے چھ اشخاص ایمان لے آئے۔ اگلے سال بارہ آدمی آ گئے اور اس سے اگلے سال پچھتر آ گئے اور بیعت عقبہ ثانیہ منعقد ہوئی۔ پھر نبی اکرم ﷺ کے قدم مبارک ابھی وہاں پہنچے بھی نہیں تھے کہ مدینہ کو دار الہجرت بننے کی سعادت حاصل ہو گئی اور وہاں حضور ﷺ کی تشریف آوری کا بڑے اشتیاق کے ساتھ انتظار ہونے لگا اور استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جبکہ مکہ جہاں حضور ﷺ بہ نفس نفیس تیرہ برس سے دعوت دے رہے ہیں، وہ خون کا پیاسا بنا ہوا ہے۔ کون سے حساب کتاب میں یہ چیز آتی ہے؟ یہ مشیت الٰہی ہے۔ آگے کے مراحل کے بارے میں کوئی لال بجھکڑ بن کر کہے کہ یوں ہو گا تو اس کی بات درخورِ اعتناء نہیں ہو گی۔ ہم اُسوۂ رسول ﷺ کے راستے پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اخلاص ہمارے شامل حال رہا تو اس راہ میں پوری زندگی کھپا کر یا سر کٹا کر دُنیوی اعتبار سے ناکام ہو جانا بھی ہمارے لئے

کامیابی ہے اور کامیاب ہو گئے تو پھر تو کامیاب ہیں ہی۔ اسی کو قرآن ''اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ'' سے تعبیر کرتا ہے۔ اس راہ میں آخرت کے اعتبار سے ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ بالاکوٹ کے میدان میں راہِ حق میں سر کٹانے والے کیا ناکام ہوئے؟ ہرگز نہیں! ان کی کامیابی پر تو فرشتے رشک کرتے ہوں گے۔ وہ تو شہادت کے مرتبے پر فائز ہیں، جو انبیاء اور صدیقین کے بعد آخرت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے۔

ہم نے اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں ''تنظیم اسلامی'' سمع و طاعت کی بیعت کی بنیاد پر بنائی ہے۔ اگرچہ ہم بہت کچے ہیں، تعداد کے لحاظ سے بھی قافلہ بہت ہی چھوٹا ہے اور اب تک جو ساتھی ملے ہیں وہ معیارِ مطلوب سے بہت نیچے ہیں۔ لیکن میں اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اس معاشرے میں سے مجھے جو ساتھی ملے ہیں وہ بھی غنیمت ہیں۔ میں اللہ کے ہاں اپنا جواب تیار کر رہا ہوں کہ اے میرے رب! میں نے کچھ اور نہیں کیا۔ مجھے تو نے جو صلاحیت، طاقت، توانائی اور استعداد عطا فرمائی تھی میں نے اسے تیری کتاب مبین کے پیغام اور اسوۂ رسول ﷺ کی طرف دعوت دینے میں لگایا اور کھپایا ہے۔ میں نے مداہنت نہیں کی ع میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند! میں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی کہ یہ کہوں گا تو اہل حدیث ناراض ہو جائیں گے اور وہ کہوں گا تو احناف مجھ سے خفا ہو جائیں گے یا لوگ میرے دروس و خطابات میں آنا چھوڑ دیں گے۔ میں نے جس بات کو قرآن و سنت کے مطابق حق سمجھا ہے اسے ڈنکے کی چوٹ کہا ہے، برملا کہا ہے 'بغیر خوفِ لَوْمَةَ لَائِمٍ' کہا ہے، صرف اللہ کے خوف اور اس بات کو پیشِ نظر رکھنے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ (ق:۱۸) ''کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لئے ایک حاضر باش نگران نہ ہو''۔ اور آج میں نے اسوۂ رسولؐ کے حوالے سے اپنی استعداد کی حد تک ساری بات آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ آپ کس مقام پر کھڑے ہیں؟ فیصلہ آپ کا ہے۔ ذمہ داری آپ کی ہے۔ جواب دہی آپ کو کرنی ہے۔ بات پوری سامنے آ چکی ہے۔ لیکن اگر کوئی تنظیم اسلامی کی دعوت کو مزید سمجھنا چاہتا ہو تو

میں اس کو دعوت دوں گا کہ وہ تنظیم کے کتابچوں کا مطالعہ کر لے، پھر فیصلہ کرے۔ میں آپ کو یہ حدیث نبویؐ سنا چکا ہوں کہ: ((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعت کا اور سمع و طاعت کا اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا''۔ چنانچہ جماعت کے بغیر زندگی بسر کرنا خلافِ سنت زندگی ہے۔ کوئی اپنی جگہ بڑے سے بڑا سنت کا پرچارک بنا ہوا ہو اور خود کو متبع سنت سمجھتا ہو، اگر وہ نظم جماعت کے بغیر زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی پوری زندگی خلافِ سنت ہے۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ۔ رضائے الٰہی اور اسوۂ رسول کی پیروی کے لئے جب تک اپنے آپ کو ایسی جماعت کے حوالے نہ کر دیا جائے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے قائم ہو، زندگی بحیثیت مجموعی سنت کے مطابق نہیں ہو گی اور بات وہی ہو گی جو حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمائی تھی کہ مچھر چھانے جائیں گے اور سموچے اونٹ نگلے جائیں گے۔

اسوۂ رسول ﷺ سے میں نے دین کے انقلابی پیغام کے لئے دعوت و تربیت، تنظیم و ہجرت اور جہاد و قتال کے مراحل اور اس کام کے لئے ایک ''تنظیم'' کی ضرورت کے دلائل آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ یہ بات قرآن حکیم سے سمجھنا چاہیں تو تھوڑے سے غور و تدبر کے بعد ان شاء اللہ سورۂ آل عمران کی یہ آیت مبارکہ تنظیم کی دعوت کو سمجھنے کے لئے کفایت کرے گی:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (آیت ۱۰۴)

''تم میں سے ایک جماعت تو ایسی ضرور ہونی چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکتی رہے۔ یہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔''

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ